فصلنامه

راہ اسلام

شمارہ : ۱۹۲ - اپریل تا جون ۲۰۰۴ء

خانۂ فرہنگ جمہوری اسلامی ایران ـ ۱۸، تلک مارگ، نئی دہلی - ۱۱۰۰۰۱

فون: ۲۳۳۸۳۲۳۲،۳۳،۳۴

فیکس: ۲۳۳۸۷۵۴۷

http://www.iranhouseindia.com

e-mail:director@iranhouseindia.com

* ایڈیٹر، پرنٹر و پبلشر:

جلال تملہ

*معاونین علمی:

ڈاکٹر علی محمد نقوی

ڈاکٹر اختر مہدی رضوی

*معاونین فنّی:

*تزئین کار : مجید احمدی و خانم عائشہ فوزیہ

*کمپوزنگ : قاری محمد یاسین

*پریس : اے۔ ایس ٹائپ سیٹر 4903 گراؤنڈ فلور
چاندنی چوک دہلی۔۱۱۰۰۰۶

* ناشر : خانہ فرہنگ جمہوری اسلامی ایران
۱۸۔تلک مارگ۔نئی دہلی۔۱۱۰۰۰۱

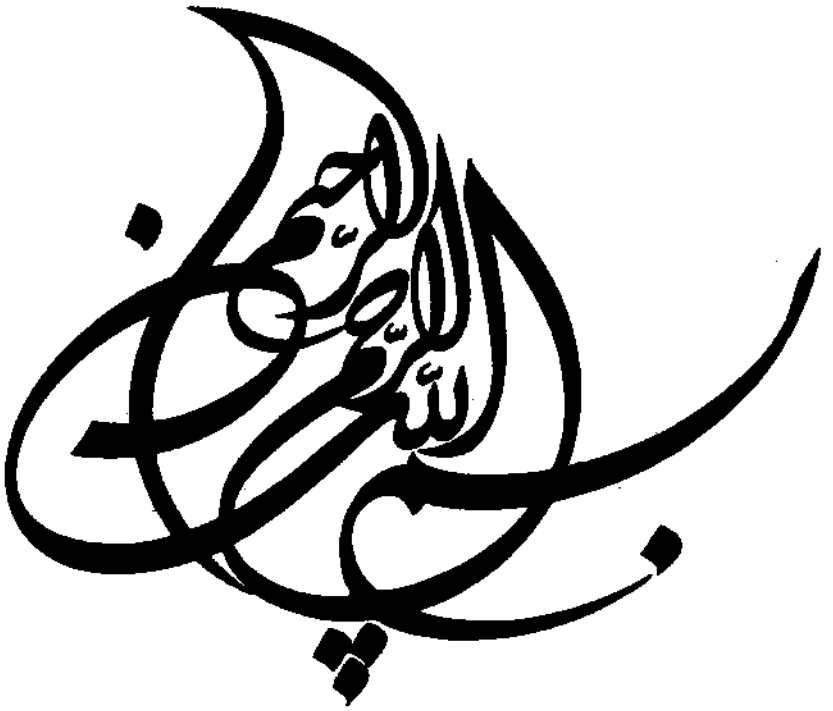

راہ اسلام میں شائع ہونے والے ہر مقالے کا اسلامی جمہوریہ ایران
کے نظریات کے مطابق ہونا لازمی نہیں ہے۔

فہرست

❁ اداریہ	وحدت واتحاد ایک عظیم الٰہی نعمت	ادارہ	۶
❁ عقائد شناسی	شیعوں کی مذہبی فکر	علامہ طباطبائی	۱۰
❁ توحید شناسی	توحید شناسی	آیت اللہ شہید بہشتی	۳۳
	اسلام دین زندگی	حجت الاسلام محمد رضا رجب نژاد	۴۵
	اسلامی فرقے	پروفیسر سید جعفر رضا	۵۴
❁ حدیث شناسی	معرفت کی صحیح منطق	استاد محمد رضا حکیمی	۶۹
❁ تاریخ اسلام	پیغمبر اکرمؐ کی ہجرت کے .....واقعات	آیت اللہ جعفر سبحانی	۸۶
❁ اسلام اور حقوق بشر	انسانی حقوق اور احادیث نبوی	ڈاکٹر احسان اللہ فہد	۹۹
	خطبہ حجۃ الوداع: اور انسانی حقوق	ڈاکٹر محمد تعظیم	۱۱۲
❁ اسلامی نظام	اسلامی اتحاد ایک عصری ضرورت	شہزاد علی	۱۳۰
	شیر مادر کی، اسلامی اور سائنسی اہمیت	وصی جعفری	۱۳۶
❁ شعر و ادب	انیسویں صدی کے بنگال کا باکمال	ڈاکٹر منصور عالم	۱۴۳
	فارسی شاعر سید محمود آزاد ایران کا چوتھی صدی ہجری کا علمی ماحول	ڈاکٹر سید صادق گوہرین	۱۵۶
	اتحاد	پیام اعظمی	۱۸۶
	دعائے اتحاد	شکیل شمسی	۱۸۷
	امیں ہیں کہ نہیں	معجز سنبھلی	۱۸۸

اداریہ:

وحدت واتحاد ایک عظیم الٰہی نعمت

تمام تعریفیں اس خدائے وحدہ لاشریک کے لئے مخصوص ہیں جو اس کائنات کا خالق و مالک ہے۔ جس نے اپنی مخلوقات کی فلاح وبہبود کو نگاہ میں رکھتے ہوئے زمین وآسمان کو زیور وجود سے آراستہ کیا اور اس دنیا کو مختلف النوع نعمتوں سے مالامال کردیا۔ جس نے اپنے برگزیدہ بندوں کو اپنا پیغمبر ورسول بنا کر اس دنیا میں بھیجا تاکہ وہ بنی نوع انسان کی ہدایت ورہنمائی کا کام انجام دیں اور لوگوں کو ہر طرح کی گمراہیوں سے بچتے ہوئے اس راہ پر چلنے کا درس دیں جو صراط مستقیم ہے اور جس پر گامزن رہنے والے عظیم الٰہی نعمتوں کے حقدار ہوتے ہیں۔ واضح رہے کہ راہ حق کی طرف ہدایت ورہنمائی کرنے والے برگزیدہ بندگان خدا کو ہی پیغمبر کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ خداوند عالم کے ان منتخب بندوں کی زندگی دنیائے بشریت کے لئے اسوۂ حسنہ اور الٰہی فیوض وہدایات و احکام کا ایسا مفید وگہرا چشمہ ہے جو کبھی خشک ہونے والا نہیں ہے۔ ان لوگوں کی زندگی نور خداوندی کا ایسا مرکز ہے جہاں تاریکی کا گزر نہیں اور مکروفریب کی تاریکیوں سے بھری ہوئی اس دنیا میں زندگی بسر کرنے والے لوگ اگر سیرت نبوی کو اپنے لئے نمونۂ عمل بنالیں تو ان کی زندگی بھی غیر معمولی نور سے منور و مالامال ہوجائے۔ اگر خداوند عالم نے ان نمونۂ روزگار شخصیتوں کو اس دنیا میں نہ بھیجا ہوتا تو پوری کائنات پر ظلم وبربریت اور غیر معمولی تاریکی وگمراہی کا بول بالا ہوتا اور کسی فرد واحد میں بھی اتنی جرأت نہ ہوتی کہ وہ ظالم کو ظالم کے نام سے خطاب کرتا۔ بہر حال خداوند عالم نے بنی نوع انسان کی ہدایت کے لئے انبیاء علیہم السلام بھیجے اور انہیں الٰہی احکامات پر

مشتمل صحیفہ ومقدس کتاب بھی عطا کی تا کہ ان صحیفوں میں مذکور الٰہی احکامات کی پیروی ہو سکے اور لوگ ہر طرح کے مفاسد سے کنارہ کشی اختیار کرتے ہوئے ایسی زندگی بسر کر سکیں جو فقط اس دنیا میں ہی نہیں بلکہ آخرت میں بھی ان کی نجات کا باعث ہو۔

تاریخ شاہد ہے کہ خداوند عالم نے حضرت محمدؐ بن عبد اللہ کو اپنا آخری ہادی ورہبر بنا کر اس دنیا میں اس وقت بھیجا جب ہر طرف غیر معمولی تاریکی چھائی ہوئی تھی اور دنیائے بشریت غیر معمولی گمراہی کے دلدل میں پھنسی ہوئی تھی اور پیغمبر اکرمؐ مقدس کتاب قرآن اور اپنے اہلبیت اطہارؑ کے مثالی اعمال کے ذریعہ راہ نجات کی نشاندہی کرنی تھی کیونکہ اس کائنات کی خلقت کا سبب انھیں کی ذات تھی چنانچہ اکثر مقامات پر واضح لفظوں میں یہ ارشاد الٰہی دیکھنے کو ملتا ہے کہ ’’اے پیغمبر اگر تمہاری خلقت مقصود نہ ہوتی تو ہم نے اس دنیا کو ہر گز خلق نہ کیا ہوتا۔‘‘ بہر حال پیغمبر اکرمؐ عظیم الٰہی مشن کے ساتھ اس دنیا میں تشریف لائے۔ وہ اس دنیا میں جو کام انجام دینا چاہتے تھے وہ آسان نہ تھا۔ دنیا پر ظلم وطاقت کی حکمرانی تھی۔ لاقانونیت نے قانون کا درجہ حاصل کر لیا تھا اور خداوند عالم کی حقیر وبے جان مخلوق یعنی سوکھی ہوئی لکڑی اور پتھروں کو خدا کا نام دیدیا گیا واضح رہے کہ فقط عرب معاشرہ میں خانہ کعبہ میں موجود ایسے ۳۶۰ سے زائد خداؤں کی موجودگی میں صرف ایک خدا کی عبادت کی طرف لوگوں کو مدعو کرنا کوئی آسان کام نہ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ جیسے ہی پیغمبر نے ’’قولوا لاالہ الااللہ وتفلحوا‘‘ کی آواز بلند کی، اس زمانے کی بڑی طاقتوں کے غلاموں نے اپنے خود ساختہ خداؤں کے دفاع کی خاطر ان پر ظالمانہ حملوں کی بھرمار کر دی لیکن پیغمبرؐ نے صبر وشکر کے ساتھ اپنا تبلیغی مشن جاری رکھا اور دفاعی سرگرمیوں کے سایہ میں لوگوں تک الٰہی پیغامات کو پہونچاتے رہے اور لوگوں کو ان کے حقیقی مقصد حیات کی طرف متوجہ کرتے رہے۔ انسانی سماج میں موجود قوم و قبیلہ اور نسل ورنگ کو جماعتوں کی شناخت کا ذریعہ قرار دیتے ہوئے ہر شخص کو اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑے رہنے کی ہدایت کرتے رہے اور لوگوں کو یہ باور کراتے رہے کہ مختلف نسلوں

اور قبیلوں کی موجودگی کا مقصد باہمی شناخت کو قائم رکھنا ہے۔ اس کو باعث اختلاف وبغض وعداوت مت بناؤ۔ نسلی یا قومی اعتبار سے کسی کو کسی پر کوئی فضیلت نہیں حاصل ہوا کرتی بلکہ فضیلت حاصل کرنے کا واحد ذریعہ تقویٰ وپرہیزگاری ہے۔ تلوار و اقتدار پر اپنی پکڑ مضبوط رکھنے کا نام اسلام نہیں ہے بلکہ اپنی جملہ خواہشات کے ساتھ بارگاہ خداوندی میں سر تسلیم خم کردینے کا نام اسلام ہے۔ اسلام کو جغرافیائی، نسلی، قومی، تمدنی اور لسانی حدود کے دائرہ میں محدود کرنا فعل عبث اور مکمل نادانی ہے۔ اسلام تو ایک آفاقی پیغام کا نام ہے۔ یہ دنیا کی تمام قوموں اور برادریوں کے درمیان اتحاد کے ذریعہ ایک عظیم عالمی اسلامی برادری کی تشکیل کا خواہاں ہے فقط مسلمانوں کے درمیان اتحاد قائم کرنا ہی اس کا آخری مقصد نہیں ہے بلکہ اتحاد بین المسلمین تو عالمی انسانی برادری کے درمیان آفاقی اتحاد کی پہلی کڑی ہے۔ اسلام کی مقدس کتاب قرآن مجید صرف مسلمانوں کی نہیں بلکہ پوری دنیائے بشریت کی ہدایت کے منصوبے کے ساتھ نازل ہوئی ہے۔ اور اس کتاب نے جس خدا کو معبود ومسجود قرار دیا ہے وہ صرف مسلمانوں کا خدا نہیں بلکہ رب العالمین ہے اور اس نے اپنے آخری ہادی ورہبر کو رحمت للعالمین بنا کر بھیجا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ جب تک بقید حیات رہے تمام مخلوقات خداوندی کے لئے مجسمۂ رحمت رہے اور ان کے بعد ان کے اہلبیت اطہارؑ اور باوفا اصحاب ان کی تعلیمات کو مشعل ہدایت بنائے رہے۔

انہیں حقائق کو نگاہ میں رکھتے ہوئے بیسویں صدی کی مایۂ ناز شخصیت امام خمینیؒ نے ایران میں اسلامی انقلاب کی کامیابی کے بعد پیغمبر عظیم الشان حضرت محمدؐ کی ولادت باسعادت کی سالگرہ کے موقع پر ہفتۂ وحدت کی تشکیل کی سفارش کی تھی تاکہ موجودہ دنیا کو پیغمبر اسلامؐ کی تعلیمات سے آشنا کیا جاسکے اور لوگوں کو یہ بتایا جاسکے کہ اسلام امن وسلامتی کا پیغامبر ہے۔ یہ ظالموں اور دشمنوں کے خلاف ہی نہیں بلکہ خود اپنے نفس کے خلاف جہاد کا درس دیتا ہے اور جہاد نفس کو جہاد اکبر کا درجہ عطا کرتا ہے۔ جہاد اکبر میں کامیابی حاصل کرنے والے لوگوں کو

عالمی اسلامی کانگریس یعنی حج کے موقع پر اپنے گھر کی طرف مدعو کرتا ہے اور ''لبّیک ، اللّٰھم لبّیک'' کا نعرہ لگاتے ہوئے ایک ہی رنگ وروپ کے حامل یہ عربی، ایرانی، ہندی، چینی، امریکی، ایشیائی اور یورپی مسلمان اس عالمی انسانی اور اسلامی برادری کی ہلکی سی جھلک پیش کرتے ہوئے نظر آتے ہیں جو پیغمبر اسلامؐ کے الٰہی مشن کا بنیادی مقصد تھا اور یہ وحدت واتحاد ہی درحقیقت عظیم الٰہی نعمت ہے جس کی کمی کی وجہ سے آج دنیائے بشریت تباہی کے دہانے تک پہونچ گئی ہے۔

درحقیقت موجودہ صدی کو اسلامی تعلیمات کی سخت ضرورت ہے ۔ دنیا اسلامی تعلیمات کی پیاسی ہے اور خود کو امت محمدی سے وابستہ سمجھنے والے ہر مسلمان کا بنیادی فریضہ ہے کہ وہ اپنے قول وعمل کے ذریعہ دنیا کو امن وسلامتی اور اخوت وبرادری کا پیغام دے اور موجودہ اسلام دشمن پروپگنڈوں کے مقابلے میں حقیقی اسلامی تعلیمات کو اجاگر کرنے میں ہمہ تن سرگرم رہے اور اس راہ میں ہر ممکن قربانی پیش کرنے میں ذرہ برابر ہچکچاہٹ محسوس نہ کرے۔ مکمل خود اعتمادی اور خداوند عالم کی لازوال طاقت پر بھروسہ کرتے ہوئے لوگوں کو حق وصداقت کی طرف متوجہ رکھنا ہی ''حقیقی راہ اسلام'' ہے اور خداوند عالم ہم لوگوں کو اس راہ پر گامزن رہنے کی توفیق عطا فرمائے۔

☆☆☆☆

عقائد شناسی:

علامہ محمد حسین طباطبائی

شیعوں کی مذہبی فکر

مذہبی فکر کے تین طریقے

''مذہبی فکر'' سے ہماری مراد طرز فکر ہے جس کا تعلق کسی مخصوص مذہب کے دینی نوعیت کے مسائل سے ہو۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے کہ 'ریاضیاتی فکر' اس طرز فکر کو کہتے ہیں جس کے مطابق ریاضی کے مسائل پر غور کیا جاتا ہے اور انہیں حل کیا جاتا ہے۔

یہ بتانے کی شاید ضرورت نہیں کہ دوسرے معاملات پر غور وفکر کی طرح مذہبی فکر کے لئے ضروری ہے کہ جس مواد پر اس کا انحصار ہو اسے معتبر ذرائع سے حاصل کیا جائے۔ اسی طرح ریاضی کے مسائل کے حل کے طریق استدلال کے لئے ریاضی کے کچھ مسلمہ حقائق اور اصول ضروری ہیں۔

قرآن مجید وہ واحد مآخذ ہے جس پر اسلام کے الہامی دین کا انحصار ہے۔ یہ قرآن مجید ہی ہے جو رسول اکرمؐ کی آفاقی وجاودانی نبوت کی قطعی گواہی دیتا ہے اور اسی مقدس کتاب میں اسلامی دعوت کی روح پوشیدہ ہے۔ بلاشبہ یہ کہنا کہ قرآن مجید اسلامی مذہبی فکر کا واحد مآخذ ہے۔ دوسرے صحیح سوچ بچار کے مآخذ کی نفی نہیں کرتا۔ اس نکتے کی وضاحت ہم بعد میں کریں گے۔

اسلام میں مذہبی فکر کے تین طریقے ہیں۔ دین اور اسلامی علوم کے مقاصد کو سمجھنے کے لئے قرآن مجید مسلمانوں کو مندرجہ ذیل تین راستے بتاتا ہے:

۱۔ دین کے ظاہری اور رسمی پہلو کا راستہ (شریعت)

۲۔ عقلی دلائل کا راستہ اور

۳۔ روحانی ادراک کا راستہ جو اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری میں اخلاص برتنے سے حاصل ہوسکتا ہے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ جہاں تک قرآن مجید کے صریح اور قطعی پہلو کا تعلق ہے وہ کوئی استدلال اور ثبوت مہیا کیے بغیر تمام بنی نوع انسان سے خطاب کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی بے نظیر حکومت پر تکیہ کرتے ہوئے انہیں حکم دیتا ہے کہ وہ توحید الٰہی، رسالت اور قیامت جیسے اصول دین کو قبول کریں۔ وہ انہیں بعض عملی احکامات (مثلاً نماز روزہ) وغیرہ کا بھی حکم دیتا ہے اور بعض کاموں سے منع بھی کرتا ہے۔ تاہم اگر قرآن مجید ان احکام کے لئے سند مہیا نہ کرتا تو لوگوں سے ان کے ماننے اور ان کی تعمیل کرنے کی توقع نہیں کی جاسکتی تھی لہذا یہ کہا جاسکتا ہے قرآن مجید کے یہ مطلق احکام دینی مقاصد اور اسلامی علوم کو سمجھنے کا ایک ذریعہ ہیں۔ ''اللہ اور اس کے رسولؐ پر ایمان لاؤ'' اور ''نماز پڑھو'' جیسے جملوں کو ہم دین کا ظاہری اور صریح پہلو کہتے ہیں۔

ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن مجید انسان کو دین کے ظاہری پہلو سے آگاہ کرنے کے علاوہ بہت سی آیات میں اسے عقلی دلائل پر توجہ دلاتا ہے۔ وہ اسے پوری کائنات اور ساتھ ہی ساتھ چھوٹے مظاہر میں اللہ کی نشانیوں پر غور کرنے کو کہتا ہے۔ وہ بہت سے حقائق کی تشریح آزاد ذہنی استدلال سے کرتا ہے سچ تو یہ ہے کہ سائنس اور عقلی علم کی جتنی تعریف قرآن مجید نے کی ہے اور جتنا زور اس کے حصول پر دیا ہے اس کی مثال دوسری مقدس کتابوں میں نہیں ملتی۔ اپنے کئی ایک ارشادات میں قرآن مجید عقلی ثبوت اور منطقی استدلال کے جواز کی تائید کرتا ہے۔ یعنی وہ اس بات کا تقاضا نہیں کرتا ہے کہ انسان پہلے اسلامی علوم کی صحت کو قبول کرلے اور پھر عقلی ثبوت کے ذریعے ان کی صحت کا جواز مہیا کرے۔ اس کے برعکس اپنے نقطہ نظر کی صحت پر یقین رکھتے ہوئے وہ اعلان کرتا ہے انسان پہلے اسلامی علوم کی صداقت کا پتہ چلانے کے

لئے اپنی عقل استعمال کرے اور جب عقلی طور پر اس کی تشفی ہوجائے تو پھر صداقت کو قبول کرے۔ اسے چاہئے کہ اسلامی دعوت کی تائید کائنات میں دریافت کرے جو کہ بجائے خود ایک سچا گواہ ہے اور بالآخر اسے اپنے ایمان کی تائید منطقی استدلال کے نتائج سے حاصل کرنی چاہئے۔ اس کے لئے یہ ضروری نہیں کہ وہ پہلے ایمان لائے اور پھر اس ایمان کی متابعت میں اس کے متعلق ثبوت تلاش کرے۔ پس فلسفیانہ غور وفکر بھی حقائق دریافت کرنے کا ایک ایسا طریقہ ہے جس کے جائز اور موثر ہونے کی قرآن مجید تائید کرتا ہے۔ ۱

مزید برآں ہم دیکھتے ہیں کہ دین کے ظاہری اور عقلی پہلو کی جانب رہنمائی کرنے کے علاوہ قرآن مجید بڑے لطیف انداز میں اس امر کی وضاحت کرتا ہے کہ ہر سچے دینی علم کا ماخذ توحید الٰہی اور اللہ تعالیٰ اور اس کی صفات کی معرفت ہے۔ اللہ کی مکمل معرفت کے حامل وہی لوگ ہیں جنہیں اس نے تمام مقامات سے ہٹا کر فقط اپنی جانب سرفراز کیا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے آپ کو اور باقی سب چیزوں کو بھلا دیا ہے اور سچے دل سے اللہ کی اطاعت کرنے کے نتیجے میں اس قابل ہوگئے ہیں کہ اپنی تمام تر قوت اور توجہ ماورائی دنیا پر مرکوز کردیں۔ قادر مطلق کے نور کے نظارے کی بدولت ان کی نگاہیں روشن ہوگئی ہیں۔ انہوں نے چشم بصیرت سے آسمان اور زمین کی بادشاہت میں چیزوں کی حقیقت کو سمجھ لیا ہے کیونکر مخلصانہ اطاعت کے ذریعے وہ یقین کی منزل پر پہنچ گئے ہیں۔ اس یقین کی بدولت آسمان اور زمین کی بادشاہتیں اور ابدی دنیا کی جاودانی زندگی ان پر عیاں ہوگئی ہیں۔

مندرجہ ذیل آیات پر غور وفکر کرنے سے اس دعوے کی مکمل تائید ہوجاتی ہے۔

"اے رسولؐ! ہم نے تم سے پہلے کوئی رسول نہیں بھیجا بجز اس کے ہم اس کے پاس وحی بھیجتے رہے کہ بس ہمارے سوا کوئی معبود نہیں۔ پس ہماری عبادت کیا کرو۔ ۲ (سورہ انبیاء۔ آیت ۲۵)

"یہ لوگ اللہ سے جو باتیں منسوب کرتے ہیں وہ ان سے بری ہے مگر اللہ کے مخلص

بندے (ایسا نہیں کہتے) ۳؎ ''سورہ صافات۔ آیات ۱۵۹ اور ۱۶۰)

''(اے رسولؐ !) کہہ دو کہ میں بھی تمہارے جیسا ہی ایک انسان ہوں۔ (فرق یہ ہے) کہ میرے رب نے میرے پاس وحی بھیجی ہے کہ تمہارا معبود واحد ہے اور جو کوئی اپنے رب سے ملاقات کا آرزومند ہو اسے چاہئے کہ اچھے کام کرے اور اپنے رب کی عبادت میں کسی کو شریک نہ ٹھہرائے۔'' ۴؎ (سورہ کہف۔آیت ۱۱۰)

'' اپنے پروردگار کی عبادت میں لگے رہو، یہاں تک کہ یقین تم تک آ پہنچے۔'' ۵؎ (سورہ حجر۔آیت ۹۹)

''یوں ہم ابراہیمؑ کو آسمانوں اور زمین کی بادشاہت دکھاتے رہے تاکہ وہ (ہماری وحدانیت کا) یقین کرنے والوں میں سے ہوجائیں۔'' ۶؎ (سورہ انعام۔آیت ۷۵)

''نہیں بلکہ نیکوں کے نامۂ اعمال علیین میں ہوں گے اور تمہیں کیا معلوم کہ علیین کیا ہے۔ وہ ایک لکھا ہوا دفتر ہے جس کی تصدیق انہوں نے کی ہے جو (اپنے رب کے) قریب لائے جاتے ہیں۔ ۷؎ (سورہ تطفیف۔آیات ۱۸ تا ۲۱)

''نہیں کاش تم (اس وقت) علم الیقین کے ساتھ جانتے ہوئے دوزخ کی آگ دیکھو گے۔ ۸؎ (سورہ تکاثر۔آیات۔۵۔۶)

پس یہ کہا جاسکتا ہے کہ دینی حقائق اور علوم کو سمجھنے کا ایک طریقہ یہ ہے کہ روح کو دنیاوی آلائشوں سے پاک کیا جائے اور خلوص دل سے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی جائے۔

جو کچھ اوپر بیان کیا گیا ہے اس سے واضح ہوجاتا ہے کہ قرآن مجید دینی حقائق کو سمجھنے کے تین طریقے بتاتا ہے، یعنی دین کا ظاہری اور صریحی پہلو، ذہنی استدلال اور اطاعت میں اخلاص جس کی بدولت ذہنی وجدان حاصل ہوتا ہے اور اس کے نتیجے میں حقیقت اور باطنی نظارے پر سے پردے ہٹ جاتے ہیں مثلاً چونکہ دین کے ظواہر آسان ترین زبان میں لفظی بیانات ہوتے ہیں اس لئے وہ سب لوگوں کی دسترس میں ہوتے ہیں اس لئے وہ سب لوگوں

کی دسترس میں ہوتے ہیں اور ہر شخص ان سے اپنی استعداد کے مطابق استفادہ کرسکتا ہے۔[۹]

اس کے برعکس دوسرے طریقے فقط خواص کے لئے مخصوص ہیں اور ہرگز عام نہیں ہیں۔ دین کے ظواہر کا راستہ اسلام کے اصولوں اور وظائف کی جانب رہنمائی کرتا ہے اور اس کے نتیجے میں اسلام کے اعتقادات اور رسول کی حقیقت اور اسلامی علوم، اخلاقیات اور فقہ سے واقفیت حاصل ہوتی ہے۔ اس لحاظ سے اس راستے میں اور دوسرے راستوں میں نمایاں فرق ہے۔ عقلی طریقہ ایمان، اخلاقیات اور عملی معاملات پر مشتمل عام اصولوں سے مربوط مسائل کا پتہ تو چلا سکتا ہے لیکن ان مخصوص دینی احکام کا پتہ چلانے سے قاصر ہے جو قرآن اور سنت میں دیئے گئے ہیں، چونکہ نفس امارہ کے تزکیہ کا راستہ انسان کی رہنمائی خداداد اور روحانی حقائق کی دریافت کی جانب کرتا ہے لہذا اس الٰہی تحفے سے جو نتائج اور حقائق برآمد ہوتے ہیں ان کی کوئی حد اور کوئی حساب نہیں ہے۔ جن لوگوں نے یہ علم حاصل کرلیا ہے وہ اللہ کے علاوہ ہر چیز سے ناطہ توڑ لیتے ہیں اور براہ راست اللہ جل شانہ کے زیر ہدایت اور زیر تسلط ہوتے ہیں۔ پھر ان پر وہ چیز ظاہر کی جاتی ہے ہے جو اللہ چاہتا ہے نہ کہ وہ چیز جس کی وہ خواہش رکھتے ہیں۔

اب ہم اسلام میں دینی فکر کے تین طریقوں کا تفصیل سے مطالعہ کریں گے۔

پہلا طریقہ: دین کا صریح پہلو

دین کے صریح پہلو کے مختلف رخ

جو کچھ اب تک کہا گیا ہے اس سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ قرآن مجید نے جو کہ اسلام میں دینی فکر کا اہم ترین ماخذ ہے اپنے الفاظ کے ظاہری معانی کو ان لوگوں کے لئے مستند قرار دیا ہے جو اس کے پیغام کی جانب توجہ دیتے ہیں۔ یہ قرآن مجید کی آیات کے ظاہری معانی ہی ہیں جنہوں نے احادیث رسولؐ کو قرآنی الفاظ کا متمم بنایا ہے اور انہیں قرآن مجید کی مانند معتبر قرار دیا ہے کیونکہ جیسا کہ قرآن مجید فرماتا ہے۔

''تم پر ذکر (قرآن) نازل کیا گیا ہے تا کہ جو احکام لوگوں کے لئے نازل کیے گئے ہیں تم ان سے صاف بیان کردو۔'' (سورہ نحل : آیت ۴۴)

''وہی تو ہے جس نے امیوں میں ایک رسولؐ بھیجا جو ان کے سامنے اس کی آیتیں پڑھتا ہے، ان کو پاک کرتا اور ان کو کتاب اور حکمت کی باتیں سکھاتا ہے۔'' (سورہ جمعہ۔ آیت ۲)

''رسولؐ تمہیں جو کچھ دے وہ لے لو اور جس سے وہ منع کرے اس سے باز رہو۔'' (سورہ حشر۔آیت ۷)

''بلاشبہ اللہ کے رسولؐ (محمدؐ) تمہارے لئے ایک اچھا نمونہ ہیں۔'' (سورہ احزاب۔آیت ۲۱)

ظاہر ہے کہ اگر رسول اللہؐ کے اقوال ور افعال حتیٰ کہ ان کی خاموشی اور تاکید ہمارے لیے قرآن مجید کی طرح سند نہ ہوتے تو مذکورہ بالا آیات کے کوئی حقیقی معانی نہ ہوتے۔ پس آنحضرتؐ کے اقوال معتبر ہیں اور جن لوگوں نے انہیں حضورؐ کی زبانی سنا یا معتبر راویوں کے ذریعے ان تک پہنچے ان کے لئے ان کا ماننا ضروری ہے۔ علاوہ ازیں قطعی طور پر معتبر راویوں کے سلسلے میں پتہ چلتا ہے کہ آنحضرتؐ نے فرمایا:

''میں تمہارے درمیان دو گرانبہا چیزیں بطور امانت چھوڑ کر جارہا ہے۔ اگر تم انہیں مضبوطی سے تھامے رکھو گے تو کبھی گمراہ نہ ہوگے، وہ دو چیزیں قرآن اور میرے اہلبیتؑ ہیں اور یہ قیامت کے دن تک ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوں گے۔

اس حدیث اور دوسری معتبر احادیث کے مطابق اہل بیت رسولؐ کے اقوال ایک ایسا مجموعہ ہیں جو آنحضرتؐ کی احادیث کا متمم ہے اہل بیت رسولؐ دینی علوم میں سند کا رتبہ رکھتے ہیں اور اسلامی تعلیمات اور احکام کی تشریح میں ان سے کسی غلطی کے سرزد ہونے کا کوئی امکان نہیں۔ ان کے وہ اقوال جو ان سے سنے جائیں یا معتبر راویوں دوسروں تک پہنچیں معتبر اور مستند ہیں۔

لہٰذا یہ امر واضح ہے کہ جس روایتی مآخذ سے دین کا صریحی اور ظاہری پہلو سامنے آتا ہے جو کہ ایک مستند دستاویز ہے اور جو اسلام میں دینی فکر کا بنیادی مآخذ ہے اس کے دو حصے ہیں اور وہ دو حصے کتاب (قرآن مجید) اور سنت ہیں۔ کتاب سے مراد قرآنی آیات کا ظاہری پہلو ہے اور سنت سے مراد رسولؐ اللہ اور ان کے اہلبیت اطہارؑ کی وہ احادیث ہیں جو ہم تک پہنچی ہیں۔

صحابہ کی بیان کردہ احادیث:

جو احادیث صحابہ کرام کی معرفت روایت کی گئی ہیں شیعیت میں انہیں اس اصول کے مطابق پرکھا جاتا ہے۔

اگر وہ احادیث رسول اکرمؐ کے اقوال اور افعال کے بارے میں بتاتی ہیں۔ اور اہل بیتؑ کی احادیث سے متضاد نہیں ہوتیں تو وہ قابل قبول ہوتی ہیں لیکن اگر وہ خود صحابہ کی اپنی آراء پر مشتمل ہوں اور اقوال رسولؐ نہ ہوں تو وہ دینی احکام کے مآخذ کے طور پر مستند نہیں ہیں۔ اس لحاظ سے صحابہ کے فتوے کسی دوسرے مسلمان کے فتوے کے برابر ہیں۔ اسی طرح خود صحابہ بھی دوسرے صحابہ سے قانون کے مسائل کے بارے میں عام مسلمانوں کی طرح سلوک کرتے تھے اور انہیں کوئی خصوصی حیثیت نہیں دیتے تھے۔

کتاب اور حدیث:

کتاب اللہ یعنی قرآن مجید ہر اسلامی فکر کا اہم ترین مآخذ ہے۔ یہ قرآن ہی ہے جو اسلام کے ہر دوسرے دینی مآخذ کو مستند اور معتبر بناتا ہے لہٰذا ضروری ہے کہ یہ سب کے لئے قابل فہم ہو۔ علاوہ ازیں قرآن مجید اپنے آپ کو ایک ایسا نور قرار دیتا ہے جو سب چیزوں کو روشن کرتا ہے۔ یہ بنی نوع انسان کو دعوت دیتا ہے کہ وہ اس کی آیات پر غور کریں۔ اور دیکھیں کہ ان میں کوئی تضاد یا تفاوت نہیں ہے۔ وہ انہیں دعوت دیتا ہے کہ اگر ان کے لئے ممکن ہو تو اس کی مثال پیش کریں۔ ظاہر ہے کہ اگر قرآن مجید سب کیلئے قابل فہم نہ ہوتا تو ان دعووں

کا کوئی جواز نہ ہوتا۔

یہ کہنا کہ قرآن مجید بذات خود سب کے لئے قابل فہم ہے ہمارے اس سابقہ دعوے کی نفی نہیں کرتا کہ رسول اکرمؐ اور ان کے اہلبیت اسلامی علوم کے لحاظ سے مرجع علمی ہیں اور علوم فی الحقیقت قرآن مجید کے مندرجات کی تفسیر ہیں مثلاً اسلامی علوم کے اس حصے کے بارے میں جو شریعت کے قوانین اور احکام پر مشتمل ہے قرآن مجید میں فقط عام اصول بیان کیے گئے ہیں۔ ان مندرجات کی وضاحت اور تفصیل (مثلاً نماز پنجگانہ کی ادائیگی، روزے رکھنے اور کاروباری لین دین کے طریقے) درحقیقت تمام عبادات اور معاملات کے بارے میں صحیح علم رسول اکرمؐ اور ان کے اہلبیتؑ کی احادیث سے ہی حاصل کیا جاسکتا ہے۔

جہاں تک ان اسلامی علوم کا تعلق ہے جو نظریات اور اخلاقی طریقوں اور رسوم کو زیر بحث لاتے ہیں کو بھی ان کا ادراک کرسکتے ہیں تاہم ان کے معانی کو مکمل طور پر سمجھنا اہلبیت رسولؐ کے طریقے کو قبول کرنے پر منحصر ہے علاوہ ازیں یہ ضروری ہے کہ قرآن مجید کی ہر آیت کے معانی دوسری آیات کے ذریعے بیان کیے جائیں۔ یہ نہیں ہونا چاہئے کہ اس کی تفسیر ان آراء کی بنا پر کی جائے جو عادات اور رسوم کی بنا پر ہم نے قبول کی ہیں۔

حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا ہے:

''قرآن مجید کے کچھ حصے دوسرے حصوں کی وضاحت کرتے ہیں اور ہمیں ان کے معانی بتاتے ہیں اور کچھ حصے دوسروں کی تصدیق کرتے ہیں۔''[10]

رسول اکرمؐ نے فرمایا ہے:

''قرآن کے کچھ حصے دوسرے حصوں کی تصدیق کرتے ہیں۔[11]

آنحضرتؐ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ:

''جو شخص قرآن کی تفسیر اپنی رائے کے مطابق کرتا ہے وہ اپنے لیے دوزخ میں جگہ تیار کرتا ہے۔''[12]

قرآن کے ذریعے قرآن کی تفسیر کی ایک سادہ مثال قوم لوط پر عذاب نازل ہونے کا قصہ ہے جس کے متعلق ایک جگہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

'اور ہم نے ان پر ایک بری بارش برسائی۔'' سورہ شعراء آیت ۱۷۳)

ایک اور مقام پر ان الفاظ میں ارشاد فرماتا ہے۔:

''بلاشبہ ہم نے ان (سب) پر پتھروں کی بوچھار کی۔''(سورہ حجر۔آیت ۷۴)

دوسری آیت کو پہلی آیت کے پہلو بہ پہلو رکھنے سے واضح ہو جاتا ہے کہ ''بارش'' سے مراد آسمان سے پتھروں کی بوچھار ہے۔ جو شخص اہل بیت رسولؐ اور جلیل القدر صحابہ کی روایت کردہ احادیث کا غور سے مطالعہ کرے اسے اس بات میں کوئی شک نہیں رہتا کہ قرآن کے ذریعے قرآن کی تفسیر ہی تفسیر کا وہ واحد طریقہ ہے جو اہل بیت اطہارؑ نے ہمیں سکھایا ہے۔ ۱۲

قرآن مجید کے ظاہری اور باطنی پہلو:

ہم پہلے اس امر کی تشریح کر چکے ہیں کہ قرآن مجید اپنے الفاظ کے ذریعے دینی مقاصد کی وضاحت کرتا ہے اور عقیدے اور اعمال کے بارے میں بنی نوع انسان کو حکم دیتا ہے تاہم قرآن مجید کے معانی انسانی سطح تک محدود نہیں ہیں بلکہ انہی الفاظ کی تہہ میں زیادہ عمیق اور وسیع معنی پوشیدہ ہیں جو فقط پاک دل اور روحانی لحاظ سے بلند پایہ اشخاص کی سمجھ میں آسکتے ہیں۔

رسول اکرمؐ جنہیں قرآن کی تعلیم دینے کا فریضہ سونپا گیا ہے فرماتے ہیں ''قرآن کا ایک دلکش ظاہر اور ایک عمیق باطن ہے۔'' ۱۳

انہوں نے یہ بھی فرمایا ہے کہ:

''قرآن کا ایک اندرونی پہلو ہے ور اس اندرونی پہلو کا ایک اور اندرونی پہلو ہے۔ اسی طرح اس کے سات اندرونی پہلو ہیں۔'' ۱۴

ائمہ اہل بیت علیہم السلام کے اقوال میں بھی قرآن مجید کے اندرونی پہلو کی جانب متعدد اشارات ہیں۔

ان دعووں کا اہم ترین ثبوت وہ مثال ہے جو اللہ تعالیٰ نے سورہ رعد کی سترھویں آیت میں دی ہے۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو بارش سے تشبیہ دی گئی ہے۔ جو آسمان سے برستی ہے اور جس پر زمین اور اس کے رہنے والوں کی زندگی کا دارومدار ہے۔ بارش برسنے پر پانی سیلاب کی شکل میں بہنے لگتا ہے اور ہر دریا میں اس کی گنجائش کے مطابق ٹھاٹھیں مارنے لگتا ہے۔ جب پانی بہتا ہے تو اس پر جھاگ آجاتی ہے لیکن اس جھاگ کے نیچے وہی پانی ہوتا ہے جو انسان کو زندگی بخشتا ہے اور فائدے پہنچاتا ہے۔

جیسا کہ تمثیلی قصے سے ظاہر ہے الٰہی علوم کے سمجھنے کی (جو کہ انسان کی باطنی زندگی کا ماخذ ہیں) استعداد ہر شخص میں مختلف ہوتی ہے۔ بعض وہ ہیں جن کے لئے دنیا کی چند روزہ مادی زندگی ہی سب کچھ ہے۔ یہ لوگ مادی فوائد میں مگن رہتے ہیں اور ان کے دل میں مادی نقصانات کے علاوہ کسی چیز کا خوف نہیں ہوتا۔ ایسے لوگوں کے بھی مختلف درجے ہوتے ہیں اور وہ زیادہ سے زیادہ الٰہی علوم کو اس حد تک قبول کرتے ہیں کہ اصول دین پر برائے نام ایمان رکھتے ہیں اور اسلام کے ارکان کو سمجھے بغیر محض ظاہری طور پر بجالاتے ہیں۔ وہ اللہ کی پرستش جزا کی امید میں یا آخرت میں سزا کے خوف سے کرتے ہیں۔

کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو اپنی فطرت کی پاکیزگی کی بنا پر عارضی دنیوی مسرتوں سے وابستگی کو اپنے لئے مفید اور کارآمد نہیں سمجھتے۔ وہ دنیوی نفع اور نقصان اور خوش آئندہ اور تلخ تجربوں کو محض دھوکے کی ٹٹی سمجھتے ہیں۔ وہ ہمیشہ ان لوگوں کا انجام یاد رکھتے ہیں جو ان سے پہلے عیش وعشرت کی زندگی بسر کرکے نابود ہوچکے ہیں اور اب فقط قصوں کہانیوں کا موضوع ہیں، وہ ایسے لوگوں کی زندگیوں سے سبق حاصل کرتے ہیں۔ ایسے پاک دل لوگ قدرتی طور پر عالم جاودانی کی طرف مائل ہوتے ہیں۔ وہ اس عارضی دنیا کے مختلف مظاہر کو

ابدی اور مستقل حقیقتیں نہیں سمجھتے ہیں بلکہ ایک بلند تر دنیا کی نشانیاں سمجھتے ہیں۔

یہی وہ مقام ہے جس پر زمینی اور آسمانی نشانیوں کے ذریعے یعنی آفاق میں اور اپنے نفسوں میں موجود نشانیوں کی بدولت انسان روحانی طور پر اللہ کے جلال اور جمال کے لامحدود نور کا نظارہ کرتے ہیں۔ ان کے دل تخلیق کے رموز کے ادراک کی خواہش سے مکمل طور پر لبریز ہو جاتے ہیں۔ ذاتی منفعت اور خود غرضی کے اندھے کنویں میں مقید رہنے کی بجائے وہ ابدیت کی لامتناہی فضاؤں میں محو پرواز ہو جاتے ہیں اور روحانی دنیا کے بلند ترین مقام کی جانب بڑھتے رہتے ہیں۔

جب وہ یہ سنتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے بتوں کی عبادت کرنے سے منع کیا ہے جس کے معنی ان کے سامنے جھکنے کے ہیں تو وہ اس کے یہ معنی لیتے ہیں کہ اللہ کے علاوہ کسی کی اطاعت نہیں کرنی چاہیے کیونکہ اطاعت کے معنی جھکنے اور خدمت کرنے کے ہیں۔ اس کے علاوہ اس کے یہ معنی بھی لیتے ہیں کہ انہیں اللہ تعالیٰ کے علاوہ نہ کسی سے امید رکھنی چاہیے اور نہ ہی کسی سے ڈرنا چاہیے۔ مزید برآں انہیں نفس امارہ کے تقاضوں کے آگے ہتھیار نہیں ڈالنے چاہئیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ انہیں اللہ کے سوا کسی پر اپنی توجہ مرکوز نہیں کرنی چاہیے۔

اسی طرح جب وہ قرآن مجید سے نماز کی ادائیگی کا حکم سنتے ہیں جس کے ظاہر معنی نماز کے مختلف مراسم بجالانے کے ہیں تو وہ اس کے باطنی معنی یہ لیتے ہیں ہے کہ انہیں جان و دل سے اللہ تعالیٰ کی عبادت اور اطاعت کرنی چاہیے۔ وہ اس کے یہ معنی بھی لیتے ہیں کہ انہیں اپنے آپ کو اللہ کے سامنے ہیچ سمجھنا چاہیے ور بھلا دینا چاہیے اور فقط اللہ کو یاد رکھنا چاہیے۔ [۱۱]

ظاہر ہے کہ ان دو مثالوں میں باطنی معانی کی موجودگی زیر نظر امر اور نہی کے ظاہری بیان کی بنا پر نہیں ہے تاہم جس شخص نے وسیع تر آفاقی نظام پر غور و فکر کرنا شروع کیا ہو اور اپنی

انا کی بجائے حقیقی کائنات کا نظارہ کرنا پسند کیا ہو اور معروضیت کو موضوعیت پر ترجیح دی ہو وہ لازمی طور پر ان معانی کا ادراک کرلیتا ہے۔

اس بحث سے قرآن مجید کے ظاہری اور باطنی پہلوؤں کے معانی واضح ہوگئے ہیں اور یہ بھی پتہ چل گیا ہے کہ قرآن مجید کے باطنی معنی اس کے ظاہری معنوں کی نفی نہیں کرتے بلکہ وہ ایک روح کی مانند ہیں جو جسم کو زندگی عطا کرتی ہے۔ اسلام کے لئے جو ایک آفاقی اور ابدی دین ہے اور بنی نوع انسان کی اصلاح پر بے حد زور دیتا ہے یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ قرآن مجید کے ظاہری قوانین کو جو معاشرے کی بہبود کے لئے ہیں یا ان سادہ معتقدات کو جو ان قوانین کی حفاظت کرتے ہیں اور برقرار رکھتے ہیں نظر انداز کردے۔

یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ ایک معاشرہ یہ کہتے ہوئے کہ دین کا تعلق فقط دل سے ہے اور دل پاک ہو تو اعمال کی کوئی اہمیت نہیں۔ کجروی کے عالم میں زندہ رہے اور اس کے باوجود خوشی اور خوشحالی حاصل کرے؟ برے اعمال اور اقوال کی موجودگی میں دل کیسے پاک ہوسکتا ہے اور اگر دل پاک ہو تو برے اعمال کیسے سرزد ہوسکتے ہیں۔؟

اللہ تعالیٰ اپنی کتاب میں فرماتا ہے:

''گندی عورتیں گندے مردوں کے لئے ہیں اور گندے مرد گندی عورتوں کے لئے ہیں۔'' (سورہ نور۔ آیت ۲۶)

اور پھر ارشاد فرماتا ہے۔

''عمدہ زمین سے اس کے پروردگار کے حکم سے (اچھا) سبزہ اگتا ہے اور خراب زمین کی پیداوار بھی خراب ہوتی ہے۔'' سورہ اعراف، آیت ۵۸)

پس ظاہر ہوتا ہے کہ قرآن مجید کے ظاہری اور باطنی پہلو ہیں اور باطنی پہلو کے معانی کی بجائے خود کئی سطحیں ہیں۔ حدیث قرآن مجید کے مندرجات کی وضاحت کرتی ہے اور خود اس کے بھی کئی پہلو ہیں۔

قرآن مجید کی تفسیر کے احکام:

اسلام کے ابتدائی دور میں بعض اہل سنت کا یہ عام عقیدہ تھا کہ کافی وجوہ کی بنا پر قرآنی آیات کے ظاہری معانی کو نظر انداز کیا جاسکتا ہے اور انہیں ان کے برعکس معنی دیئے جاسکتے ہیں جو عموماً اس کے ظاہری لغوی معنوں سے مختلف ہوتے تھے، انہیں 'تاویل' کہا جاتا تھا اور سنی اسلام میں "تاویل قرآن" کے الفاظ انہیں معانی میں استعمال ہوتے ہیں۔

سنی علما کی دینی کتابوں اور مختلف مکاتب کے مابین ہونے والے ان مباحثوں سے، جو ضبط تحریر میں لائے گئے ہیں، یہ پتہ چلتا ہے کہ اگر کوئی مخصوص نظریہ (جو کسی مکتب کے علماء کے اجماع یا کسی اور ذریعے سے قائم ہوا ہو) قرآن مجید کی کسی آیت کے ظاہری معنی کے برعکس ہو تو تاویل کرکے اس آیت کے معنی اس کے ظاہری معنی کے برعکس بیان کیے جاتے ہیں بعض اوقات مباحثہ کرنے والی دو جماعتیں جو ایک دوسرے سے متضاد رائے رکھتی ہوں اپنی آراء کے جواز میں قرآن مجید سے استدلال کرتی ہیں۔ فریقین میں سے ہر ایک دوسرے فریق کی پیش کی ہوئی آیات کی تاویل کرتا ہے۔ یہ طریق کار کسی نہ کسی حد تک شیعیت میں بھی سرایت کرگیا اور بعض شیعی دینی کتابوں میں اس کی جھلک نظر آتی ہے۔

تاہم اگر قرآنی آیات اور اہلبیت رسولؐ کی احادیث کا بغور مطالعہ کیا جائے تو یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ قرآن مجید کی زبان دلکش اور اسلوب بیان فصیح اور واضح ہے اور وہ ہر مضمون کی مناسبت سے زبان استعمال کرتا ہے اور وہ بیان کے الجھادینے والے طریقے استعمال نہیں کرتا۔ جس کو صحیح معنوں میں قرآن مجید کی تاویل کہا جاتا ہے اس کا تعلق فقط لفظی اشارات سے نہیں ہے بلکہ ان حقائق اور معارف سے ہے جو عام لوگوں کے لئے ناقابل فہم ہیں۔ اس کے باوجود وہ حقائق اور معارف ہیں جن سے اصول دین اور قرآن مجید کے عملی احکام کے سوتے پھوٹتے ہیں۔

سارے کا سارا قرآن مجید تاویل اور باطنی معنوں کا حامل ہے جنہیں انسانی ذہن

براہ راست سمجھنے سے قاصر ہے۔ اس دنیا کی زندگی میں فقط انبیائے کرامؑ اور اولیاء اللہ جو دنیا وی آلائشوں سے پاک وپاکیزہ ہیں ان معانی کو سمجھ سکتے ہیں، البتہ قیامت کے دن قرآن مجید کی تاویل سب پر ظاہر کردی جائے گی۔

اس دعوے کی تشریح اس امر کی طرف اشارہ کرکے کی جاسکتی ہے کہ جو چیز انسان کو الفاظ ایجاد کرنے اور بولنے پر مجبور کرتی ہے وہ اس کی معاشرتی اور مادی ضروریات کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔ اپنی معاشرتی زندگی میں انسان اپنے خیالات، ارادے اور احساسات اپنے ہم جنسوں کو سمجھانے پر مجبور ہوتا ہے۔ یہ مقصد حاصل کرنے کے لئے وہ بولنے اور سننے کی قوتیں استعمال کرتا ہے بعض اوقات وہ اپنی آنکھیں بھی استعمال کرتا ہے اور اشاروں سے بھی کام لیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نابینا اور بہرے لوگ ایک دوسرے کی بات نہیں سمجھ پاتے کیونکہ جو بات نابینا شخص زبان سے کہتا ہے وہ بہرا سن نہیں پاتا اور جو کچھ بہرا اشاروں سے کہتا ہے وہ نابینا دیکھ نہیں پاتا۔

الفاظ کی ایجاد اور چیزوں کے نام رکھنے کا عمل مادی مقاصد کو مدنظر رکھتے ہوئے انجام دیا گیا ہے۔ ان اشیاء اور کیفیات کے لئے الفاظ گھڑے گئے ہیں۔ جو مادی ہیں اور جنہیں محسوس کیا جاسکتا ہے جیسا کہ ہم دیکھتے ہیں، اگر ہم کسی ایسے شخص سے مخاطب ہوں جو جسمانی حواس میں سے کسی ایک حس سے عاری ہو اور ہم اسے کوئی ایسی چیز سمجھانا چاہیں جس کا ادراک اس ناموجود حس سے ہوسکتا ہے تو ہم مثالوں اور تشبیہوں سے کام لیتے ہیں۔ مثلاً اگر ہم کسی نابینا شخص کو روشنی اور رنگ کے بارے میں بتانا چاہیں یا ایک نابالغ بچے کو جنسی میل ملاپ کی لذت سے آگاہ کرنا چاہیں تو ہم تقابل تشبیہوں اور مثالوں سے ملتے ہیں۔

لہٰذا اگر ہم یہ نظریہ قبول کرلیں کہ عالم ہستی میں حقیقت کے بہت سے ایسے معیارات ہیں جو مادی دنیا سے ماوراء ہیں اور (حقیقت بھی یہی ہے) اور دنیا میں ہر دور میں فقط چند لوگ ایسے ہوتے ہیں جو حقائق کو سمجھ سکتے ہیں تو پھر عالم بالا کے مسائل عام الفاظ اور

عام طرز فکر سے سمجھ میں نہیں آسکتے۔ ان کے بارے میں فقط کنائے اور تشبیہ کے ذریعے ہی بات کی جاسکتی ہے۔ چونکہ دینی حقائق کی نوعیت ایسی ہی ہے اس لئے ان معاملات کے بارے میں قرآن مجید کے مندرجات لازمی طور پر اشاری ہیں۔

اللہ تعالیٰ اپنی کتاب میں فرماتا ہے:

"ہم نے اس کتاب کو عربی زبان میں نازل کیا تاکہ تم سمجھ سکو اور بے شک یہ لوح محفوظ میں بھی جو ہمارے پاس ہے لکھی ہوئی ہے اور یقیناً بڑے رتبے اور حکمت والی کتاب ہے۔" (اس کی گہرائیوں تک پہنچنا عام ادراک کی بات نہیں۔(سورہ زخرف۔آیات ۳۔۴)

پھر فرماتا ہے۔

"بے شک یہ بڑے رتبے کا قرآن ہے جو لوح محفوظ میں لکھا ہوا ہے۔ اس کو صرف وہی لوگ پاسکتے ہیں جو پاکیزہ ہیں۔"

(سورہ واقعہ۔آیات ۷۷ تا ۷۹)

رسول اکرمؐ اور ان کے اہل بیتؑ کے بارے میں ارشاد ہوا ہے:

"اے اہل بیتؑ! اللہ تو بس یہ چاہتا ہے کہ تمہیں ہر طرح کی برائی سے دور رکھے اور اس طرح پاک وپاکیزہ کردے جیسا کہ پاک وپاکیزہ کرنے کا حق ہے۔" (سورہ احزاب۔آیت ۳۳)

جیسا کہ ان آیات سے ثابت ہوتا ہے قرآن مجید ایسے ماخذ سے نکلا ہے جو عام آدمی کی سمجھ سے باہر ہے۔ ان اللہ کے بندوں کے علاوہ جنہیں اس نے پاک وپاکیزہ کرنے کے لئے منتخب کیا ہے، کوئی دوسرا قرآن مجید کے معانی کو مکمل طور پر نہیں سمجھ سکتا اور اہل بیت رسولؐ کا شمار انہیں پاک وپاکیزہ بندوں میں ہوتا ہے۔

ایک اور مقام پر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

"نہیں، بلکہ جس قرآن کو وہ سمجھ نہ سکے اسے جھٹلانے لگے حالانکہ اس کی تاویل بھی ان کے پاس نہیں آئی۔" (سورہ یونس۔آیت ۳۹)

پھر فرماتا ہے۔:

''جس دن قرآن مجید کی تاویل کا وقت آجائے گا (یعنی قیامت کے دن) وہ لوگ جو اسے بھول بیٹھے تھے کہیں گے: بے شک ہمارے پروردگار کے سب رسول حق لیکر آئے تھے۔''(سورہ اعراف ۔آیت ۵۳)

حدیث :

حدیث کے قابل قبول ہونے کے بارے میں ۔جیسا کہ قرآن مجید نے تصدیق کی ہے۔ اہل تشیع کے درمیان بلکہ تمام مسلمانو کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہے لیکن چونکہ ابتدائی دور کے کچھ اسلامی حاکم حدیث کی حفاظت کرنے سے قاصر رہے اور آنحضرتؐ کے کچھ صحابہ اور پیروؤں نے حدیث کی تبلیغ میں بے اعتدالی سے کام لیا اس لئے حدیث کے مجموعے کو کچھ مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ ایک طرف خلفائے وقت نے حدیث کو ضبط تحریر میں لانے کی ممانعت کردی اور حکم دیا کہ جن کاغذات پر احادیث لکھی ہوں وہ جلادیے جائیں۔ بعض اوقات حدیث کی دوسروں تک ترسیل اورمطالعے پر بھی پابندی لگا دی گئی[۱] اور یوں بہت سی احادیث فراموش ہوگئیں یا ضائع ہوگئیں اور کچھ اصل متن سے ہٹ کر اور غلط انداز میں روایت کی گئیں۔ دوسری جانب آنحضرتؐ کے کچھ ایسے صحابہ میں جنہوں نے آپ کی زیارت کی تھی اور خود آپ کے دہان مبارک سے احادیث سنی تھیں ایک اور رجحان پیدا ہوگیا۔ ان صحابہ نے جن کا خلفاء اور عامۃ المسلمین احترام کرتے تھے بڑے جوش وخروش سے حدیث کی تبلیغ شروع کردی۔ اس معاملے میں اس قدر مبالغے سے کام لیا گیا کہ بعض اوقات حدیث کو قرآن پر بھی فوقیت دی گئی اور بعض لوگوں نے یہ دعویٰ کیا کہ بعض قرآنی احکام کو حدیث نے منسوخ کردیا ہے[۲] اکثر حدیث روایت کرنے والے ایک حدیث سننے کی خاطر دور دراز کا سفر کرتے اور سفر میں پیش آنے والی صعوبتیں برداشت کرتے۔

بعض غیر مسلموں نے جنہوں نے اسلام کا لبادہ اوڑھ رکھا تھا اور خود مسلمانوں میں

موجود بعض اسلام دشمنوں نے احادیث میں تحریف کرنی شروع کردی اور انہیں مسخ کرنے لگے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جن احادیث کا لوگوں کو علم تھا ان کی صحت مشکوک ہوگئی ۱۸۔ چنانچہ مسلمان علماء اس مسئلے کا حل تلاش کرنے کے بارے میں غور کرنے لگے انہوں نے صحیح اور ضعیف احادیث میں امتیاز کرنے کے لئے ایسے علوم وضع کیے ہیں جن کا تعلق راویان حدیث کے حالات اور حدیث کی روایت کے سلسلے سے تھا۔ ۱۹۔

حدیث کی تحقیق کے بارے میں شیعیت کا طریقہ:

ایک حدیث کو صحیح ماننے کے لئے شیعیت اس کے راویوں کے بارے میں تحقیق کرنے کے لئے اس چیز کو بھی ایک ضروری شرط قرار دیتی ہے کہ اس کا متن قرآن مجید سے مطابقت رکھتا ہو۔ شیعیت کے مآخذ میں رسول اکرمؐ اور ائمہ اطہار علیہم السلام سے معتبر راویوں کے سلسلے میں بہت سی احادیث روایت کی گئی ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ جو احادیث قرآن مجید سے متصادم ہوں ان کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہے فقط وہی حدیث قابل قبول ہوسکتی ہے جو قرآن مجید سے ہم آہنگ ہو ۲۰۔ ان کے محض احادیث ہونے کی بنا پر شیعیت ان احادیث پر عمل نہیں کرتی جو قرآن مجید سے متضاد ہوں۔ اگر کچھ احادیث ایسی ہوں جن کا ائمہ اطہار علیہم السلام کی جانب سے دی گئی ہدایات کی روشنی میں قرآن سے اتفاق یا تضاد طے نہ ہوسکے تو شیعیت انہیں قبول یا رد کیے بغیر ان کے بارے میں سکوت اختیار کرلیتی ہے۔ ۲۱۔ جیسا کہ سبھی جانتے ہیں اہلسنت کے ایک گروہ کی طرح اہل تشیع میں بھی کچھ ایسے لوگ ہیں جو مختلف ذرائع سے حاصل شدہ حدیث کو قبول کرلیتے ہیں۔

حدیث کو قبول کرنے کے بارے میں شیعیت کا طریقہ:

جو حدیث رسول اکرمؐ یا کسی امامؑ کے دہن مبارک سے سنی گئی ہو وہ قرآن کی طرح قبول کرلی جاتی ہے۔ جہاں تک ان احادیث کا تعلق ہے جو ہم تک بالواسطہ پہنچی ہیں، اگر ان

کے راویوں کا سلسلہ ہر مرحلے پر مسلم ہو یا ان کی صحت کا حتمی ثبوت موجود ہو اور قرآن مجید کے ارشاد کے مطابق ان کا تعلق دین کے ان اصولوں سے ہو جن کے لئے علم اور یقین کی ضرورت ہے تو ایسی احادیث اہل تشیع کی اکثریت کے لئے قابل قبول ہوتی ہیں۔ حدیث کی ان دو قسموں کے علاوہ دینی نظریات کے متعلق کوئی حدیث قابل قبول نہیں ہوتی اور نا قابل قبول احادیث کو ''خبر واحد'' کا نام دیا جاتا ہے۔ ۲۲ تاہم ان وجوہ کی بناپر جو بیان کی گئی ہیں شریعت کے احکام کو مسلم کرنے کے لئے اہل تشیع ان احادیث پر بھی عمل کرتے ہیں جو معتبر سمجھی جاتی ہیں لہذا یہ کہا جاسکتا ہے کہ جو حدیث یقینی اور مسلم ہو شیعیت میں اس کے مطابق عمل کرنا لازمی ہے لیکن جو حدیث حتمی طور پر مسلم نہ ہو لیکن عموماً معتبر سمجھی جاتی ہو اسے احکام شریعت کی وضاحت کے لئے استعمال کیا جاسکتا ہے۔

اسلام میں تعلیم وتعلم:

اسلام میں علم حاصل کرنا ایک دینی فریضہ ہے۔ رسول اکرمؐ نے فرمایا ہے کہ کہ علم حاصل کرنا ہر مسلمان مرد اور عورت پر فرض ہے ۲۳ ان مسلمہ احادیث کے مطابق جو آنحضرتؐ کے اس قول کی وضاحت کرتی ہیں کہ اصول سہ گانہ اسلامی (توحید، نبوت ورقیامت) کا علم حاصل کرنا بقیہ تمام علوم پر مقدم ہے۔ نیز مسلمانوں کو چاہئے کہ ان اصولوں کے علاوہ اپنے اپنے حالات اور ضروریات کے مطابق فروعی معاملات اور اسلام کے احکام اور قوانین کی تفصیل کے بارے میں بھی علم حاصل کریں۔

یہ امر واضح ہے کہ اصول دین کا علم حاصل کرنا، گو وہ مختصر ہی کیوں نہ ہو کسی حد تک ہر ایک کے لئے ممکن ہے لیکن کتاب اور سنت کے بنیادی مآخذ اور فنی استدلال کی مدد سے دینی احکام اور قوانین کا مفصل علم حاصل کرنا (جسے فقہ استدلال کہا جاتا ہے) ہر مسلمان کے بس کی بات نہیں اور فقط چند اشخاص اس فقہ کے حصول کی استعداد رکھتے ہیں۔ علاوہ ازیں اس قسم کا مفصل علم حاصل کرنا ہر ایک کے لئے ضروری بھی نہیں کیونکہ اسلام کسی شخص کی استعداد سے

بڑھ کر اسے کام کا ذمے دار نہیں ٹھہراتا۔ ۳۴؎

لہٰذا واجب کفائی کے اصول کے تحت فقہ اسلامی کا مطالعہ ان لوگوں تک محدود کردیا گیا ہے جو ضروری استعداد رکھتے ہیں اور اس قسم کے مطالعہ کے اہل ہیں۔ اس عام اصول کے تحت کہ جو لوگ مسائل سے ناواقف ہیں وہ ان لوگوں پر انحصار کریں جو مسائل کو جانتے ہیں۔ باقی لوگوں کا وظیفہ یہ ہے کہ وہ قابل اہل علم سے رہنمائی حاصل کریں جو کہ مجتہد اور فقیہ کہلاتے ہیں۔ مجتہدین کی پیروی کرنے کے اس عمل کو تقلید کہا جاتا ہے۔

بلاشبہ یہ تقلید اس تقلید سے مختلف ہے جس کی قرآن مجید نے ممانعت کی ہے چنانچہ سورۂ بنی اسرائیل کی ۳۶ ویں آیت میں ارشاد ہوا ہے کہ:

"اے انسان! اس چیز کا پیچھا نہ کر جس کا تجھے یقین نہ ہو۔"

(یعنی اصول ومعارف میں تقلید جائز نہیں ہے۔)

یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ شیعیت کسی ایسے مجتہد کی تقلید کرنے کی اجازت نہیں دیتی جس کا انتقال ہوچکا ہو۔ دوسرے لفظوں میں کسی ایسے شخص کے لئے جو کسی مسئلے کا جواب اجتہاد یا دینی وظیفے کے ذریعے نہ جانتا ہو ضروری ہے۔ کہ کسی زندہ مجتہد کی تقلید کرے۔ اس کیلئے مجتہد کے فتوے پر عمل کرنا جائز نہیں جو فوت ہوچکا ہو تاوقتیکہ اس نے کسی مسئلے کے بارے میں رہنمائی اس مجتہد کی زندگی میں حاصل نہ کی ہو۔ یہ طریق کار ان عوامل میں سے ایک ہے جنہوں نے شیعہ اسلامی فقہ کو ہر دور میں زندہ اور تروتازہ رکھا ہے۔ چنانچہ اہل تشیع میں ایسے حضرات ہمیشہ موجود رہے ہیں جنہوں نے ہر دور میں فقہی مسائل کے بارے میں اجتہاد کیا ہے۔

اہل سنت میں ایک اجماع کے نتیجے میں جو چوتھی صدی ہجری میں وقوع پذیر ہوا، چار مکاتب (حنفی، مالکی، شافعی، اور حنبلی) میں سے کسی ایک کی پیروی لازمی قرار دی گئی۔ آزادانہ اجتہاد یا ان چار مکاتب (یا ایک دو اور چھوٹے مکاتب جو بعد میں معدوم ہوگئے) کے علاوہ کسی اور مکتب کی پیروی ممنوع قرار دی گئی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی فقہ کی اب بھی وہی

کیفیت ہے جو آج سے گیارہ سو سال پہلے تھی ۔ کچھ مدت سے بعض سنی علماء نے مذکورہ بالا اجماع سے اختلاف کرتے ہوئے آزادنہ اجتہاد شروع کردیا ہے۔

شیعیت اور علوم نقلیہ:

اسلامی علوم جو ان علمائے اسلام کے مرہون منت ہیں جنہوں نے انہیں مرتب کیا دو حصوں یعنی عقلی علوم اور نقلی علوم میں تقسیم کیے جاتے ہیں ۔عقلی علوم میں فلسفہ اور ریاضی وغیرہ شامل ہیں جبکہ نقلی علوم (مثلاً لغت ، حدیث اور تاریخ) کا انحصار کسی نقل کے مآخذ پر ہے۔ بلاشبہ نقلی علوم کے اسلام میں ظہور کا سب سے بڑا سبب قرآن مجید ہے۔علم تاریخ علم انساب اور علم وعروض جیسے علوم کو چھوڑ کر باقی سب علوم کتاب اللہ کے زیر اثر وجود میں آئے ہیں دینی مباحثوں اور تحقیق کے نتیجے میں مسلمانوں میں ان علوم کا ذوق پیدا ہوا۔ ان علوم میں سب سے زیادہ اہم عربی ادب (یعنی صرف، نحو، معانی ، بیان بدیع،لغت وغیرہ) اور وہ علوم جن کا تعلق دین کے ظواہر سے ہے (مثلاً قرأت،تفسیر ، حدیث رجال، درایہ، اصول اور فقہ وغیرہ)

ان علوم کی بنیاد رکھنے اور انہیں پروان چڑھانے میں اہل تشیع نے بڑا اہم کردار ادا کیا۔ درحقیقت ان میں سے بہت سے علوم کے بانی مبانی شیعہ تھے۔رسول اکرمؐ اور حضرت علیؑ کے صحابی ابو اسود دوئلی نے حضرت علیؑ کی رہنمائی میں عربی کی صرف ونحو ترتیب دی جنہیں آپ نے صرف ونحو کا خاکہ لکھوایا۔۲۵ علم فصاحت اور بلاغت (معانی بیان وبدیع)کا بانی صاحب بن عباد نامی ایک شیعہ تھا جو آل بویہ کا وزیر تھا ۲۶ سب سے پہلی عربی لغت کتاب العین ہے جو خلیل ابن احمد بصری نے مرتب کی ۔ یہ ایک شیعہ علم تھا جو عالم عروض کا بانی اور نحو کے مشہور ماہر سیبویہ کا استاد تھا۔

عاصم کی قرأت قرآن کا سلسلہ ایک واسطے سے حضرت علیؑ سے جاملتا ہے ورعبد اللہ ابن عباسؓ جو علم تفسیر کے بارے میں سب صحابہ سے بلند مرتبہ ہیں، حضرت علیؑ کے شاگرد تھے۔ اہل بیت رسولؐ اور ان کے تربیت یافتہ لوگوں نے حدیث اور فقہ کے سلسلے میں جو

خدمات انجام دیں ان سے بھی واقف ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ سنی فقہ کے چاروں مکاتب کے بانیوں نے اہل بیت کے پانچویں اور چھٹے اماموں سے فیض حاصل کیا۔ موجودہ شہادتوں کی روشنی میں کہا جا سکتا ہے کہ اصول فقہ کو شیعہ عالم وحید بہ بہائی اور ان کے بعد شیخ مرتضی انصاری نے جتنی ترقی دی اس کی مثال سنی فقہ میں نہیں ملتی۔

حوالے:

۱۔ جیسا کہ مقدمے میں ذکر کیا گیا ہے کہ شیعی دنیا میں تھیوسوفی یا حکمت کی روایت مسلسل چلی آرہی ہے جسے فلسفہ بھی کہا جاتا ہے اور فاضل مصنف نے اس کتاب میں اس کی جانب اکثر جگہ اشارہ کیا ہے تاہم یہ فلسفے کا ایک روایتی مکتب ہے اور اس کا تعلق الٰہیات اور روحانیت کے ذرائع سے ہے۔ اسے غیر مذہبی اور خالصاً عقلی طرز تفکر کا مترادف سمجھنا غلط ہے۔ گو یہ فلسفہ بھی عقلی استدلال اور منطق کے قوانین سے استفادہ کرتا ہے لیکن اس سے اہل مغرب کا سا فلسفہ مراد نہیں ہے۔

۲۔ اس آیت سے ہم یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ خدا کے دین میں عبادت توحید کی ایک شاخ اور اس کی بنیاد اسی (یعنی توحید) پر ہے۔

۳۔ کسی چیز کی صفات بیان کرنے کا انحصار اسکے بارے میں علم پر ہے اس آیت سے پتہ چلتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو بجز ان لوگوں کے جو با اخلاص اور پاکیزہ ہیں کوئی بھی اس طرح نہیں پہچان سکتا ہے جس طرح اسے پہچاننا چاہئے اور دوسرے لوگ جو صفات اس سے منسوب کرتے ہیں وہ ان سے بالاتر ہے۔

۴۔ ہم اس آیت سے یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ خدا تعالیٰ سے ملاقات کا توحید اور عمل صالح کے سوا کوئی راستہ نہیں ہے۔

۵۔ اس آیت سے یہ پتہ چلتا ہے کہ خدا کی حقیقی پرستش کا نتیجہ یقین کی صورت میں نکلتا ہے۔

۶۔ اس آیت سے ہم یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ یقین کے لوازمات میں سے ایک آسمانوں اور

زمین کے ملکوت کا مشاہدہ ہے۔

۷۔ ان آیات سے پتہ چلتا ہے کہ ''ابرار'' کی قسمت ایک کتاب میں درج ہے جس کا نام 'علّیین' (بہت بلند) ہے اور جس کا مشاہدہ وہ لوگ کرتے ہیں جو خدا کے قریب ہیں، علاوہ ازیں یشھدہ (تصدیق کیا گیا) کا لفظ ظاہر کرتا ہے کہ یہاں کتاب سے مراد اس کے عام معنی نہیں ہیں بلکہ یہ قرب الٰہی اور ارتقا کی جانب اشارہ ہے۔

۸۔ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ علم الیقین کی بدولت بدکردار لوگوں کے انجام کا مشاہدہ کیا جاسکتا ہے جو کہ ''جحیم' (جہنم) ہے۔

۹۔ اسی حقیقت کی جانب اشارہ کرتے ہوئے رسول اکرمؐ ایک حدیث میں جو سنی اور شیعہ دونوں نے نقل کی ہے فرماتے ہیں۔

''ہم پیغمبروں کا طبقہ لوگوں سے ان کی عقل کے معیار کے مطابق بات کرتا ہے۔''

(بحار الانوار جلد ۱ صفحہ ۸۷ اور اصول الکافی کلینی جلد ۱۔ صفحہ ۲۰۳ مطبوعہ تہران ۱۳۸۷ھ)

۱۰۔ نہج البلاغہ خطبہ ۱۳۳ اس مسئلہ پر مصنف کی کتاب ''قرآن در اسلام'' میں بھی بحث کی گئی ہے۔

۱۱۔ الدر المنثور جلد ۲ صفحہ ۶

۱۲۔ تفسیر الصافی ملا محسن فیض کاشانی ص۔ ۸ مطبوعہ تہران ۱۲۶۹ھ اور بحار الانوار جلد ۱۹ ص۔ ۲۸۔

۱۳۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ علامہ طباطبائی نے قرآن مجید کی ضخیم تفسیر 'المیزان'' کے سلسلہ میں بھی یہی طریقہ اختیار کیا ہے۔

۱۴۔ تفسیر الصافی ص۔ ۴

۱۵۔ رسول اکرمؐ سے یہ حدیث تفسیر الصافی ص۔ ۱۵ سفینۃ البحار، عباس قمی نجف ۵۵۔ ۱۳۵۲ھ اور دوسری معروف تفسیروں میں نقل کی گئی ہے۔

۱۶۔ بحار الانوار جلد ۱ ص ۱۱۷

۱۷۔قرآن مجید کی بعض آیات کی تنسیخ یا بدل کا مسئلہ علم اصول کے مشکل مسائل میں سے ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ کم از کم چند سنی علماء تنسیخ کے قائل ہیں۔ واقعہ فدک سے بھی پتہ چلتا ہے کہ حدیث کے ذریعے قرآنی آیات کی مختلف تعبیریں کی گئی ہیں۔

۱۸۔اس قول کا ثبوت وہ بہت سی کتابیں ہیں جو روایتی دینی علما نے وضعی (جعلی) احادیث کے متعلق لکھی ہیں علاوہ ازیں 'رجال' کی کتابوں میں بہت سے راویوں کو غیر معتبر اور ضعیف کہا گیا ہے۔

۱۹۔ احادیث کے بارے میں روایتی اسلامی تنقید کو اور صحیح اور وضعی احادیث کے مابین امتیاز کرنے کیلئے مقرر کئے گئے معیارات کو ان یورپی مستشرقین کی تنقید سے گڈمڈ نہیں کرنا چاہئے جو احادیث کے سارے مجموعے پر اعتراض کرتے ہیں اسلامی نقطہ نگاہ کے مطابق ان کا یہ فعل اسلام کے مکمل ڈھانچے پر شدید ترین وحشیانہ حملے کے مترادف ہے۔

۲۰۔ بحار الانوار جلد ۱ ص ۔ ۱۳۹

۲۱۔ بحار الانوار جلد ۱ ص۔ ۱۱۷

۲۲۔خبر واحد پر بحث کے لئے اصول کی کتابوں سے رجوع کریں۔

۲۳۔ بحار الانوار جلد ۱ ص ۔ ۵۵

۲۴۔ ان مسائل کے بارے میں علم اصول کی کتابوں میں اجتہاد اور تقلید پر بحث سے رجوع کرنا چاہئے۔

۲۵۔ وفیات الاعیان ۔، ابن خلکان (ص۔ ۷۸) مطبوعہ تہران ۱۲۸۴ھ اعیان الشیعہ محسن عاملی (جلد ۱۱ ص۔ ۲۳۱) مطبوعہ دمشق ۱۹۳۵ء ومابعد۔

۲۶۔ وفیات الاعیان ص۔ ۱۹۰۔ اعیان الشیعہ ، اور حکماء کی سوانح عمریوں کی دوسری کتابیں۔

☆☆☆

آیت اللہ شہید ڈاکٹر بہشتی

توحید شناسی

توحید یعنی ہر جہت اور زاویہ سے خدا کو ایک سمجھنا وہ یکتا ہے وہی خالق ہے۔ وہی کائنات کے وسیع نظام کو حرکت دینے والا اور اسے منظم کرنے والا ہے۔صرف وہی عبادت کا پرستش کا سزاوار ہے۔ اسکے علاوہ دوسرے اور بھی لاتعداد پہلوؤں سے وہ ایک ہے۔

قرآن حکیم کی اکثر آیتوں میں اللہ کی وحدانیت اس کی خلقت ، اس کے امر یعنی نظام کائنات ، اور عبادت کے حوالے سے بیان کی گئی ہے۔قرآن سب سے پہلے اس نکتہ کی جانب ہماری توجہات کو مرکوز کرنا چاہتا ہے کہ اس کائنات بسیط کا خالق اور اس کے نظام کو چلانے والی ذات ایک ہے۔ اسی کا حکم ہے جو سارے جہان پر جاری اور ساری ہے۔کائنات کی حکومت صرف ذات خدا کے لئے مخصوص ہے اور اسی لئے صرف وہی عبادت اور پرستش کا سزوار ہے۔

خلق وامر پر قرآن کی دلیل توحید:

قرآن اس منظم کائنات اور اس کے بے مثل ونظیر حسن اور ہم آہنگی کو خود اس کے خالق کے یکتا ہونے کی واضح دلیل شمار کرتا ہے اور ہمیں یہ حکم دیتا ہے کہ ہم اس دقیق ترین اور لامحدود نظام کی وسعتوں اور اس کے نظم وضبط پر غور کریں تا کہ ہم پر یہ حقیقت روز روشن کی طرح واضح ہوجائے کہ اس کا خالق اور محرک ایک ذات مطلق ہے۔ وہ تو ایک ہی معبود حقیقی ہے اس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں، وہی رحمٰن ورحیم ہے ۔ بلاشبہ آسمانوں کے اور زمین کے بنانے میں اور یکے بعد دیگرے رات اور دن کے آنے میں اور جہازوں میں جو سمندر

میں چلتے ہیں آدمیوں کے نفع کی چیزیں اور مال واسباب لیکر اور پانی میں جسے اللہ نے آسمان سے برسایا پھر اس سے زمین کو تروتازہ کیا جبکہ وخشک تھی اور پھر ہر قسم کے حیوانات اس میں پھیلادیئے اور ہواؤں کے بدلنے میں اور ابر میں جو زمین اور آسمان کے درمیان مقید رکھا ہے، ان لوگوں کے لئے (توحید) کی دلیلیں ہیں جو عقل سلیم رکھتے ہوں" قرآن ۲: ۱۶۳ - ۱۶۴)

دوسری تمام ایسی آیتیں ہیں جو مختلف پیرائے میں اسی مضمون کو بیان کرتے ہوئے نظام کائنات کو خالق کی وحدانیت کی دلیل کے طور پر پیش کرتی ہیں۔

نظریہ شرک کا ابطال:

قرآن ذیل کے انداز میں نظریہ شرک کو باطل قرار دیتا ہے۔" اللہ نے کسی کو اولاد قرار نہیں دیا ہے اور نہ اس کے ساتھ کوئی اور خدا ہے اگر ایسا ہوتا تو ہر خدا اپنی مخلوق کو جدا کر لیتا اور ایک دوسرے پر چڑھائی کرتا اللہ ان (مکروہ) باتوں سے پاک ہے جو یہ لوگ اس کی نسبت بیان کرتے ہیں۔ جاننے والا ہے سب پوشیدہ اور آشکارا کا۔ وہ ان تمام لوگوں کے شرک سے بالاتر اور منزہ ہے۔" قرآن ۲۳: ۹۱ - ۹۲)

اگر کائنات کے ایک سے زائد خالق فرض کئے جائیں تو انکا باہمی رشتہ ان تین میں سے کسی ایک حالت کے مطابق ہوگا:

۱۔ ان مختلف خداؤں کی مملکت کائنات کے مختلف حصوں میں الگ الگ اور آزادانہ ہوگی جنہیں (بفرض محال) انہوں نے خود خلق کیا ہے۔ اس صورت میں دنیا کے الگ الگ حصوں میں الگ الگ نظام ہوں گے جو ایک دوسرے سے یکسر جدا ہوں گے۔ مگر ہم یہ دیکھتے ہیں کہ کائنات میں صرف ایک ہی نظام ہے جو سب پر جاری ہے۔

۲۔ ان مختلف خداؤں میں ایک کی حیثیت سب سے بلند ہے اور وہی پورے نظام کو ہم آہنگی اور وحدت عطا کرتا ہے۔ اس صورت میں وہی ایک بزرگ وبرتر ہی اصل حاکم ہوگا اور باقی دوسرے خداؤں کی حیثیت اس کے کارکنان کی ہوگی۔

۳۔ اس کائنات میں یہ سارے خدا مکمل طور پر آزاد اور خود مختار ہیں اور اپنی مرضی کے مطابق احکام صادر کرتے ہیں ۔ اس صورت میں یہ سارا نظام درہم برہم ہوجائے اور یہ دنیا مکمل طورپ بدنظمی کا شکار ہوجائے گی جیسا کہ قرآن کا ارشاد ہے:

اگر (زمین اور آسمان میں) اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی دوسرا معبود ہوتا تو دونوں درہم برہم ہوجاتے۔ اللہ تعالیٰ مالک عرش ان امور سے پاک ہے جو لوگ بیان کرتے ہیں' (قرآن ۲۱: ۲۲)

اس طرح نظام عالم کی یگانگی اور ربطنظر یہ شرک کو خود پوری طرح باطل قرار دیتا ہے جس کی ایک فرضیہ کے سوا اور کوئی حقیقت نہیں۔

اس طرح یہ فرض کرلیا کہ دو یا دو سے زیادہ خدا ایک ہی قلمرو میں حکمرانی کریں گے اور ان میں کوئی اختلاف بھی نہ ہوگا، ایک خواب وخیال ہے ۔ یہ دوئی خود اس بات کی متقاضی ہے کہ ان میں کسی نہ کسی موقع پر اختلاف ضرور ہو۔

علل واسباب:

قرآن جو خلقت اور نظام کائنات کو توحید خالق کی دلیل کے طور پر پیش کرتا ہے ، نظام ہستی میں وجود اسباب وعلل اور ان کی حقیقت کا بھی انکار نہیں کرتا ۔قرآن کے مطابق :

''واللہ انزل من السماء ماء فاحیا بہ الرض بعد موتھا ان فی ذالک لایۃ لقوم یسمعون '' اور اللہ نے آسمان سے (بادلوں کے ذریعے) پانی برسایا جس سے مردہ زمین پھر سے زندہ ہوا ٹھی اور بے شک ان باتوں میں سامعین کے لئے بڑی نشانیاں ہیں (قرآن ۱۶: ۶۵)یہاں پانی کو زمین کے لئے حیات بخش وسیلے کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔

وجود اسباب وعلل کے حوالے سے قرآن ہمیں یہ بتاتا ہے کہ در اصل اللہ ہی قادر مطلق اور خالق کائنات ہے ۔ وہ ہر شئی کا جاننے والا اور خبر رکھنے والا ہے مگر اس نے نظام کائنات کے لئے کچھ اصول قوانین وضع کئے ہیں اس نے کچھ اشیاء کو دوسری اشیاء کے پیدا

کرنے کا وسیلہ قرار دیا ہے اور انہیں ان کے کام پر مامور کیا ہے۔ اس طرح پیدا کرنے والی اشیاء کا کام صرف اتنا ہے کہ اللہ سبحانہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق اپنے کام کو انجام دیتے ہیں۔

سورج اپنی تمامتر قوت جاذبہ وکشش کے باوجود حکم الٰہی کا پابند ہے۔ زمین کی قوت کشش خود ایک بڑی طاقت ہے لیکن وہ بھی اس امر الٰہی کے سامنے سرتسلیم جھکائے ہوئے ہے۔ جو ایک چھوٹے پرندے کو بھی اتنی توانائی عطا کر دیتا ہے کہ وہ سطح زمین کو چھوڑ کر گھنٹوں فضا میں پرواز کرتا رہے۔

خدا: سبب ساز بھی سبب سوز بھی:

یہ بسیط نظام ہستی جو قرآن کی نظر میں بھی ایک قوی ترین نظام ہے اور جس کے نہ جانے کتنے ایسے راز ہائے سربستہ ہیں جن پر سے پردہ اٹھنا ابھی باقی ہے۔ انسان اپنی فکر اور خداداد صلاحیتوں کے بھروسے پر اس نظام کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے جس میں اسے تھوڑی بہت کامیابی نصیب ہوئی ہے۔ درحقیقت یہ نظام ہے ہی اتنا وسیع جس کی حدود کا اندازہ لگاتے ہوئے سیکڑوں انسانی پشتیں گزر گئیں۔ یہ علت ومعلول میں بندھا ہوا مضبوط نظام جسے خود خالق نے اس کے لئے وضع کیا ہے۔ خود خالق کے سامنے کیا حیثیت رکھتا ہے؟ قرآن کے مطابق خداوند کریم جس نے کائنات کو قانون اسباب وعلل کے ذریعے حرکت دی ہے وہ خود ان قوانین کا محتاج نہیں ہے، بلکہ اس نے چند مواقع پر اس نظام فطرت کو خود توڑ کر بتایا کہ نظام اس کا محتاج ہے وہ خود اپنے بنائے ہوئے نظام کا محتاج نہیں ہے۔ چنانچہ قرآن میں حضرت ابراہیمؑ کا حال بیان کرتے ہوئے ارشاد ہوا: لوگوں نے کہا جلا ڈالو اسے اور اس نے خداؤں کا بدلہ لو اگر تم صاحب عمل ہو'' مگر ہم نے کہا'' اے آگ ابراہیمؑ پر سرد ہو جا مگر سلامتی کے ساتھ'' ان لوگوں نے اس گزند پہنچانا چاہا مگر ہم نے ان کی تدبیریں ناکام کر دیں'' (قرآن ۲۱: ۶۸-۷۰)

اس طرح اگر خدا چاہے تو اپنے ایک فرمان سے جس طرح اس نے ایک فرمان سے

اشیاء کو خلق کیا ہے، آگ سے اس کی حرارت چھین لے۔

آج انسان نے جب اپنے اندر اتنی توانائی پیدا کرلی ہے کہ محض ایک بٹن دبانے سے، یا کسی الکٹرانک سگنل کے ذریعے وہ بارودی سرنگ یا مہلک بم کو، جو اسی کی ایجاد ہے، پھٹنے سے روک سکتا ہے تو خدائے وحدہٗ لاشریک جس نے اس نظام کو خلق کیا ہے کسی شئی کو اپنے عمل سے کیوں نہیں روک سکتا؟

معجزات:

ایک حساس انسان کے لئے جو تھوڑی سی بھی عقل وشعور رکھتا ہو معجزے کی فطرت کو سمجھنا مشکل نہیں ہے اگر وہ مادی اسباب وعلل اور اللہ اور اس کی قدرت کے باہمی ربط کو سمجھتا ہو۔ اسلامی آفاقیت کے مطابق معجزات کا وقوع پزیر ہونا عین ممکن بات ہے۔ اس کا قانون اسباب وعلل سے کوئی ٹکراؤ نہیں ہے جو یہ کہتا ہے کہ کوئی شئی بغیر علت کے ظاہر نہیں ہوئی کیونکہ معجزات کے پیچھے جو علت کارفرما ہوتی ہے اس کا نام ہے مشیت الٰہی۔ معجزات کا ظہور نہ صرف بطور کلی قانون اسباب سے کوئی اختلاف نہیں رکھتا، بلکہ بہ اعتبار علمی اور عملی بھی نظام علت ومعلول سے ناسازگار نہیں ہے۔ کیونکہ انسان سائنسی اور تجرباتی قوانین کی شناخت میں قوانین مطلق وبے استثنا کے انتظار میں نہیں بیٹھا رہتا۔ علوم جدید کے جاننے والے یہ بات اچھی طرح جانتے ہیں کہ" قانون نسبیت تمام سائنسی قوانین میں شامل ہے۔

سائنسداں حضرات انہی نسبی قوانین کو اپنی تحقیق میں استعمال کرکے علمی اور تکنیکی نتائج حاصل کرتے ہیں، جب تک کہ دوسریت قوانین انہیں باطل ثابت نہ کردیں ہم اپنی روز مرہ کی زندگی میں بھی کبھی ۱۰۰ فی صد یقین نہ ہونے کی وجہ سے کسی کام کو التواء میں نہیں ڈالتے۔

دنیا کے تمام ذی شعور انسان کاروں، ریل گاڑیوں، ہوائی جہازوں، بسوں وغیرہ میں اکثر سفر کرتے ہیں جبکہ سبھی یہ جانتے ہیں کہ ان میں سے کوئی بھی ذریعہ ۱۰۰ فی صد یقین

کرنے کے قابل نہیں ہے، اچھی سے اچھی کار اور جدید سے جدید ہوائی جہاز بھی کبھی نہ کبھی کسی نہ کسی حادثے کا شکار ہو سکتے ہیں چاہے اس کے امکانات کتنے ہی کم کیوں نہ ہوں۔ لیکن اس کی وجہ سے انسان سفر کرنا چھوڑ دے؟ ہرگز نہیں۔ کیونکہ انسانی منصوبے کی بنیاد معمول کے حالات پر رکھتا ہے ایمرجنسی پر نہیں، خاص کر اس وقت جب کہ اس ایمرجنسی کے امکانات بہت ہی کم ہوں جیسے ایک فی ہزار یا اس سے بھی کم اسی طرح معجزات کا ظہور بھی شاذونادر کبھی حکم الٰہی کے ذریعے ہوتا ہے جس کا تناسب عمومی حالات کے ساتھ بہت ہی کم ہوتا ہے۔ لیکن اس ایک استثنائی حادثے کی وجہ سے عام حالات میں جاری ہونے والے قانون اسباب کی اہمیت میں ذرہ برابر بھی کمی واقع نہیں ہوتی

موہوم اشیاء کو سبب نہیں سمجھنا چاہئے:

اسلام کی اہم ترین تعلیمات میں سے ایک یہ بھی کہ ہمیں کسی شئی کی علت اور اس کے اثرات کو جاننے کے لئے واضح علم اور روشن دلائل پر تکیہ کرنا چاہئے نہ کہ بے بنیاد وہم وگمان پر۔ توہمات پر ایمان انسان کو علمی اور صنعتی میدانوں میں کافی پیچھے دھکیل دیتا ہے۔ علم طب میں یہ صدیوں سے ہوتا چلا آرہا ہے۔ اسی طرح انسان کے اعمال اور مقدر پر آسمانی کروں کے اثرات پر ایمان رکھنا اور علم نجوم پر تکیہ کرنا انسان کی ترقی کی راہوں میں کئی طرح سے رکاوٹ پیدا کرتا ہے۔

قرآن صراحت کے ساتھ ہمیں یہ تعلیم دیتا ہے کہ ہم اپنی تحقیق میں کبھی توہمت اور گمان پر بھروسہ نہ کریں بلکہ واضح اور یقین دلیل کو بنیاد بنائیں قرآن میں جن مقامات پر اس خطرے سے آگاہ کیا گیا ہے وہ ذیل میں درج ہیں (سورہ نجم آیت ۲۸ اور ۲۳، سورہ بقرہ آیت ۳، سورۃ یونس آیت ۶۸، اور سورہ انعام آیت ۵۸)

دعا: اللہ سبحانہ تعالیٰ نے دعا کو انسانی معاملات میں ایک موثر سبب قرار دیا ہے یعنی انسان کو بہ کمال خلوص اپنے خالق کی جانب توجہ کرنی چاہئے اور دعا کے ذریعے اس سے

امداد طلب کرنی چاہئے ۔ یہ صحیح ہے کہ اللہ عالم مطلق ہے وہ کائنات کی ہر شئی سے باخبر ہے یہاں تک کہ دلوں کے راز بھی اس پر واضح ہیں مگر جس طرح نظام کائنات میں کچھ پانے کے لئے محنت کرنی ہوتی ہے اسی طرح بندے اور خالق کے رشتوں میں بھی یہی قانون کارفرما ہے۔قرآن کا ارشاد ہے:

اور جب آپ سے میرے بندے میرے متعلق دریافت کریں تو (آپ کہئے) کہ میں قریب ہی ہوں ۔ ہر درخواست کرنے والے کی عرض جو میرے حضور پیش کرے قبول کرلیتا ہوں ان کو چاہئے کہ میرے احکام قبول کیا کریں اور مجھ پر یقین رکھیں امید ہے کہ وہ لوگ رشد و فلاح حاصل کرسکیں گے" (قرآن ۲: ۱۸۶)

دعا کے سلسلے میں اکثر یہ سوال کیا جاتا ہے کہ کیا اللہ کی مشیت میں بھی کوئی بدلاؤ ممکن ہے؟ اس نے ہمیں دعا کا حکم کیوں دیا جبکہ اس کی مشیت میں کوئی تغیر ممکن نہیں ہے؟

اسلامی طرز فکر کے مطابق اس سوال کا جواب یہ ہے کہ ذات خدا ابدی ہے اسی طرح اس کی مشیت بھی ادنیٰ وابدی ہے جس میں کوئی تغیر نہیں، مگر اسی نا قابل تغیر مشیت نے یہ بات مقدر کردی ہے کہ کائنات کا ایک بڑا حصہ یعنی جہان طبیعی ہر لحظہ ایسے حالات پیدا کرتا ہے جس کے اسباب اس کے پہلے کے عوامل ہوں۔ دعا ایک قسم کی سعی ہے جو انسان کے اعمال اور اس کے حالات کے بدلنے میں ایک کردار نبھاتی ہے اور یہ اسی نا قابل تبدیل ارادۂ الٰہی کے ذریعہ ہمارے لئے مقدر کیا گیا ہے۔

یعنی ذات واجب ازلی ہے، اس کی مشیت اور اس کا علم بھی ازلی ہے ۔ پھر بھی ہر آن نئے حالات وقوع پذیر ہوتے ہیں اور دعا ان میں سے کچھ کے واقع ہونے میں ایک مؤثر کردار ادا کرتی ہے۔"اسی سے (اپنی اپنی حاجتیں) سب آسمان والے اور زمین والے مانگتے ہیں، اور ہر وقت وہ کسی نہ کسی کام میں رہتا ہے (قرآن ۵۵: ۲۹)

اگر انسان کسی مصیبت میں گرفتار ہوجائے تو اسے حالات سے گھبرا کر مایوس نہ ہوجانا

چاہئے اور نہ ہی اپنی کوششیں موقوف کرنی چاہئیں بلکہ خلوص دل کے ساتھ خدائے تعالیٰ کے حضور دست دعا بلند کرنا چاہئے کیونکہ اسے نہیں پتہ کہ کب اسکے حالات پلٹ جائیں جیسا کہ قرآن کہتا ہے ''ہر لحظہ اس کے لئے ایک نئی شان ہے'' اس کے بھی امکانات کافی روشن ہیں کہ کچھ نئے حالات پیدا ہوں اور اس کی پریشانی ختم ہوجائے۔

قرآن میں متعدد مقامات پر ایسے واقعات کا ذکر ملتا ہے جہاں ساری امیدوں کے برعکس حالات ایک دم بدل گئے او خدا کے نیک بندوں کے لئے سازگار ہوگئے جیسے جناب موسیٰ کا مدد مانگنا (سورہ طہ ۲۵ اور ۲۶) جناب ذکریا کا ایک بیٹے کے لئے دعا کرنا (سورہ مریم ۱۔ ۹) اور مثالوں سے واضح ہے کہ قرآنی نقطہ نظر سے دعا بھی مختلف اسباب میں سے ایک موثر سبب ہے۔ جس طرح کارخانہ حیات میں خالق نے ہر مخلوق جیسے نور، حرارت، برق، کشش وغیرہ کے لئے ایک کردار معین کیا ہے جس طرح اس نے پیڑ پودوں اور کیمیائی مرکبات میں بیماریوں کے لئے شفا رکھی ہے اسی طرح اس نے خلوص دل اور پاک جذبہ سے کی گئی دعا کو انسانی خواہشات کو پورا کرنے کا ایک سبب قرار دیا ہے۔ دعا کا اثر صرف نفسیاتی یا علامتی مان لینا ایک بھول ہوگی۔ یہ سچ ہے کہ دعا انسان کی بعض پژمردہ صلاحیتوں کو بیدار کرنے کا ایک ذریعہ ہے اور اس کی قوت ارادی میں خاطر خواہ اضافہ ہوجاتا ہے مگر قرآنی طرز فکر کے مطابق دعا کے اثرات اس سے کہیں زیادہ دور رس ہیں۔ دعا بجائے خود قانو اسباب وعلل میں ایک آزاد ور موثر سبب ہے اور اسے محض نفسیاتی اثرات کے دائرے میں محدود نہیں کیا جاسکتا۔

عبادت میں توحید یکتا پرستی:

جیسا کہ ہم نے پہلے کہا ہے، قرآن ہر چیز سے پہلے ''یکتا پرستی'' اور ''عبادت میں توحید'' کی اہمیت کا قائل ہے اور اسے توحید خدا کا ایک منطقی نتیجہ قرار دیتا ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ خدا ہی اس نظام ہستی کو عدم کی گہرائیوں سے وجود کی سطح پر لانے والا ہے، اور وہی اکیلا

اس وسیع وعریض نظام کا ناظم بھی ہے جس میں کسی شئی کا اپنا آزاد اکوئی کردار نہیں ہے، دوسروں کا کردار اس ضمن میں صرف اتنا ہے کہ وہ اس کی دی گئی ذمہ داریوں کو بہ تمام وکمال ادا کریں۔ دنیا میں قوت اور توانائی کے جتنے بھی ممکن مصادر ہیں جیسے سورج، چاند، نجوم سیارے، ابر، ہوا، پانی، برق زمین، جنات، ملائکہ وغیرہ سب اسی کے زیر فرمان اور اس کے سامنے سرنگوں ہیں۔ جب ہم اتنا کچھ جانتے ہیں تو پھر اس کے بعد کسی مخلوق یا بت اور تصویر کی گنجائش ہی کہاں بچتی ہے۔قرآن کہتا ہے:

''اے لوگوں عبادت اختیار کرو اپنے پروردگار کی جس نے تم کو پیدا کیا اور ان لوگوں کو بھی کہ جو تم سے پہلے گزر چکے ہیں، شاید کہ تم متقی ہوجاؤ۔ وہ ذات پاک ایسی ہے جس نے زمین کو تمہارے لئے فرماش اور آسمان کو چھت قرار دیا۔ اور پھر آسمان سے پانی برسایا جس کے ذریعے اس نے (مختلف) پھلوں اور غذاؤں کو تمہارے لئے پردہ عدم سے نکالا، تو اب اللہ کے مقابل کسی شئی کو مت ٹھہراؤ اور تم سمجھ بوجھتے ہو۔'' (قرآن ۲: ۲۱۔ ۲۲)

'' اور ان لوگوں نے شیاطین کو اللہ کا شریک قرار دے رکھا ہے، حالانکہ ان لوگوں کو خدا نے پیدا کیا ہے اور ان لوگوں نے اللہ کے حق میں بیٹے اور بیٹیاں بلا سند تلاش رکھی ہیں۔ وہ پاک اور برتر ہے ان باتوں سے جن کو یہ لوگ بیان کرتے ہیں۔ وہ آسمانوں اور زمین کا موجد ہے۔ اس کے اولاد کیونکر ہوسکتی ہے جبکہ اس کی کوئی زوجہ نہیں ہے، اور اسی نے ہر شئی کو پیدا کیا اور وہ ہر شئی کو خوب جانتا ہے یہ ہے تمہارا رب، اس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں ہر شئی کا پیدا کرنے والا ہے تو تم اسی کی عبادت کرو اور وہ ہر شئی کا کارساز ہے'' (قرآن ۶: ۱۰۱۔ ۱۰۳)

'' اور منجملہ اس کی (قدرت اور توحید کی) نشانیوں کے لئے رات اور دن ہے اور سورج ہے اور چاند ہے پس تم لوگ نہ سورج کو سجدہ کرو اور نہ چاند کو، اور صرف اس خدا کو سجدہ کرو جس نے ان (سب نشانیوں) کو پیدا کیا۔'' (قرآن ۴۱: ۳۷)

کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جو خدائے تعالیٰ کے علاوہ دوسروں کو بھی (خدائی کا) شریک قرار دیتے ہیں اور انسے ایسی محبت رکھتے ہیں جیسی محبت اللہ سے رکھنا ضروری ہے اور جو مومن ہیں انہیں اللہ سے قوی محبت ہے۔'' (قرآن ۲: ۱۶۵)

اگر عبادت اور تسلیم مدد طلب کرنے کے معنی میں ہے تو یہ بھی اللہ ہی کا حق ہے کیونکہ وہی مخلوق کی حاجتوں کو پورا کرنے کی قدرت رکھتا ہے۔

''کہئے: کیا ہم اللہ کے سوا (اوروں کو) پکاریں جو نہ تو نفع پہنچا سکتے ہیں اور نہ ہی نقصان'' (قرآن ۶: ۷۱)

اگر ایک وجود ناقص کی شیفتگی اور شیدائی کسی وجود کامل کے جلال، وکمال، وجمال کے لئے ہو تو بھی یہ صرف ذات خدا کے لئے مخصوص ہے کیونکہ وہی اس عشق ومحبت کا حقیقی سزوار ہے۔

تسلیم واطاعت میں توحید:

قرآن کے نقطہ نظر سے اطاعت دو قسم کی ہیں۔

۱۔ اطاعت جو مکمل تسلیم اور غیر مشروط سپردگی کی صورت میں ہو۔ قرآن کے تصور توحید کے مطابق اس طرح کی اطاعت جو درحقیقت ''عبودیت'' ہے، صرف ذات خدا سے مخصوص ہے اور اس کے سوا کوئی اس کا سزاوار نہیں ہے۔

۲۔ ایسے لوگوں کی اطاعت جو ہم پر حق برتری رکھتے ہیں اور جن کی اطاعت خود ہمارے یا معاشرے کے لئے سودمند ہو۔ پیغمبرؐ امام اور ان کے نمائندوں کی اطاعت اسی زمرے میں آتی ہے۔ یہی حال ماں باپ کی اطاعت کا ہے۔ مگر اس قسم کی اطاعت مشروط نوعیت کی اطاعت ہے۔ یعنی دوسروں کی اطاعت صرف اسی وقت تک ہے جب تک وہ اصول عدل اور حکم الٰہی کے مطابق ہو اور حدود سے تجاوز کی مانگ نہ کرے۔ انسان کو ان احکام کو حکام سے ہرگز قبول نہ کرنا چاہئے جو قانون شریعت اور حکم الٰہی کے مخالف ہوں۔ البتہ نبی اور امام کے لئے چونکہ یہ پہلے سے ثابت ہے کہ وہ معصوم ہیں اور کوئی حکم حکم شریعت کے خلاف

نہیں دیں گے۔ اسکی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

توحید اجتماعی:

عبادت اور اطاعت میں توحید کا لازمی نتیجہ یہ ہونا چاہئے کہ مومنین اپنے تمام دینی والہی مسائل میں حکم الہی اور ''وحی الہی'' کے آگے سر تسلیم خم کردیں۔ ان کی ہمبستگی اور اتحاد کو باقی رکھنے اورفرقہ بندی کا شکار نہ ہوجانے کی غرض سے ان کو ضمن میں کوئی اختیار نہیں دیا گیا ہے۔قرآن اس سلسلے میں یہ فرماتا ہے:

''اور انجیل والوں کو چاہئے کہ اللہ تعالیٰ نے جو کچھ اس میں نازل فرمایا ہے اس کے موافق حکم کیا کریں اور جو شخص اللہ تعالیٰ کے نازل کیے ہوئے کے موافق حکم نہ کرے تو ایسے لوگ بالکل بے حکمی کرنے والے ہیں اور ہم نے یہ کتاب آپ کے پاس بھیجی ہے جو خود بھی صدق کے ساتھ موصوف ہے اور اس سے پہلے جو کتابیں ہیں ان کی بھی تصدیق کرتی ہے اور ان کی محافظ ہے تو ان کے باہمی معاملات میں اس بھیجی ہوئی کتاب کے موافق فیصلہ فرمایا کیجئے اور جو سچی کتاب آپ کو ملی ہے اس سے دور ہوکر انکی خواہشوں پر عمل درآمد نہ کیجئے۔تم میں سے ہر ایک کے لئے ہم نے خاص شریعت اور خاص طریقت تجویز کی تھی۔ اور اگر اللہ کو منظور ہوتا تو تم سب کو ایک ہی امت کردیتا لیکن (ایسا نہیں کیا) تاکہ جو دین تم کو دیا ہے اس میں تم سب کا امتحان فرمائے تو مفید باتوں کی طرف دوڑو تم سب کو خدا کے پاس جانا ہے پھر وہ تم سب کو بتلادے گا جن میں تم اختلاف کیا کرتے تھے۔ اور (ہم مکرر حکم دیتے ہیں) کہ آپ ان کے باہمی معاملات میں اس بھیجی ہوئی کتاب کے موافق فیصلہ فرمایا کیجئے اور ان کی خواہشوں پر عمل درآمد نہ کیجئے اور ایسے بہتر کاموں کے لئے احتیاط رکھئے کہ وہ آپ کو خدائے تعالیٰ کے بھیجے ہوئے کسی حکم سے بھی ہلا نہ دیں پھر اگر یہ لوگ اعراض کریں تو یہ یقین کرلیجئے کہ بس خدا ہی کو منظور ہے کہ ان کے بعض جرموں پر ان کو سزا دے اور زیادہ آدمی تو بے حکم ہی کے ہوتے ہیں۔ یہ لوگ پھر کیا زمانۂ جاہلیت کا فیصلہ چاہتے ہیں اور یقین رکھنے والوں کے نزدیک اللہ

سے بہتر فیصلہ کرنے والا کون ہوگا۔'' (قرآن ۵: ۴۷-۵۰)

ان آیتوں میں اسی بات کو خوبصورت انداز میں پیش کیا گیا ہے کہ خدا پرستوں کو بیکار اور بے معنی جھگڑوں اور فساد سے بچتے ہوئے وحی الٰہی کے مطابق اپنے لئے خیروسعادت کی تلاش کرنا چاہئے اور اسے پانے میں ہرگز دیر نہ کرنی چاہئے تمام آسمانی مذاہب کے ماننے والوں کے درمیان تضاد وتفرقہ کے بجائے باہمی ربط ہونا چاہئے۔ رہا یہ سوال کہ کیا صحیح ہے کیا غلط تو اس کا فیصلہ وحی الٰہی پر چھوڑ دینا چاہئے، اگر اس کی تفسیر میں کوئی اختلاف ہو تو اسے اس دن کے لئے اٹھا رکھنا چاہئے جب خدائے تعالیٰ خود حق سے پردہ اٹھائے گا اور ہر اختلاف ختم ہوجائے گا۔ خدا پرستوں کے درمیان اتحاد کا یہی ایک طریقہ ہے ورنہ پھر تمام انبیاء کے پیروکار بلکہ وہ بھی جو اسی نبی کے پیروکار ہیں اور اسی کتاب کے ماننے والے ہیں مگر مختلف نظریات رکھتے ہیں سب ایک دوسرے کے دشمن بن جائے گے اور وحی الٰہی کا نور مدھم پڑ جائے گا۔

اس طرح قرآن اللہ کی توحید کو اس پورے نظام کی بنیاد سمجھتا ہے اور فرقہ وارانہ اختلاف کو کجروی بتاتا ہے۔ وہ تمام مذہبی اختلاف کو روح توحید کے منافی شمار کرتے ہوئے اسے معاشرے کے اتحاد کی راہ میں ایک بڑی رکاوٹ قرار دیتا ہے۔ اس ضمن میں صرف علمی مباحث، جو ہر طرح کے ذاتی تعصب سے پاک ہوں کی اجازت دی گئی ہے۔

☆☆☆☆

حجت الاسلام محمد رضا رجب نژاد

اسلام
دین زندگی

پیغمبر عظیم الشان کی زندگی میں جو اتار چڑھاؤ، مختلف النوع حوادث اور اثر انگیزی دکھائی دیتی ہے وہ دنیا کے کسی دوسرے شخص کی زندگی میں ہرگز نظر نہیں آتی کیونکہ ان کی زندگی میں حیرت انگیز، اسرار آمیز اور ہیجانی پہلوؤں کی فراوانی وکثرت پائی جاتی ہے۔

ان کا دین جس تیز رفتاری کے ساتھ ابتدائی مرحلہ میں خود اپنے معاشرہ وماحول میں اور اس کے بعد پوری دنیا میں جس سرعت وتیز رفتاری کے ساتھ پھیلا اس کی مثال دنیا کی تاریخ میں کہیں نہیں دکھائی دیتی ہے اور اس دین نے عالمی انسانی سماج پر جو گہرے نقوش قائم کئے ہیں ان کی مثال بھی کم ہی نظر آتی ہے۔

پوری دنیائے بشریت میں انسانی سماج کے پسماندہ طبقے سے تعلق رکھنے والا کوئی بھی شخص ان کی طرح ایک عظیم الشان اور پرشکوہ عالمی تہذیب وتمدن کا خالق نہیں رہا ہے۔

پیغمبرؐ اسلام کے سلسلے میں عالمی سطح پر جتنی کتابیں لکھی گئی ہیں اتنی تالیفات دنیا کی کسی دوسری عظیم شخصیت کے بارے میں نہیں پائی جاتی ہیں اور دنیا کے مورخین ومفکرین اور دانشوروں نے جس خصوصی توجہ کے ساتھ ان کی زندگی کے ہر گوشے پر اظہار خیال کیا ہے اس کی کوئی مثال نظر نہیں آتی اور یہ ایسی حقیقت ہے جس کا مشرق ومغرب کے تمام مورخین اعتراف کرتے ہیں۔

جس زمانہ میں پورے جزیرۂ عربستان میں ایسی تہذیبی رولیات اور خرافاتی تمدن وثقافت پورے انسانی معاشرہ میں رائج تھی جس کا انسانی عقل وفطرت سے کوئی سروکار نہ تھا اور ظلم وبربریت کی وجہ سے عالمی انسانی برادری کا دم گھٹ رہا تھا، خداوند عالم کے ارادہ سے ۵۷۰ء میں سعادت کا درخشاں ستارہ طلوع ہوا اور اس دنیا میں اس بچہ کی ولادت ہوئی جس کا نام ''محمد'' رکھا گیا اگر چہ اس نومولود کی ولادت سے پہلے ہی اسکے والد کا انتقال ہو چکا تھا۔

اس نومولود نے صرف تین روز تک اپنی والدہ (حضرت آمنہ) کا دودھ پیا اس کے بعد خداوند عالم نے دوسری دوعورتوں کو اس مولود مبارک کی دایہ بننے کا شرف عطا کردیا۔

پیغمبرؐ اسلام کی پہلی دایہ کا بیان ہے کہ جس وقت مجھے اس بچہ کو دودھ پلانے کی ذمہ داری سونپی گئی، میں نے بچے کی ماں کے سامنے اس کو دودھ پلانا چاہا، میرے بائیں پستان میں دودھ اترا ہوا تھا۔ میں نے بڑی کوشش کی لیکن بچہ میرے داہنے پستان کی طرف زیادہ مائل تھا۔ دشواری یہ تھی کہ بچہ دار ہونے کے بعد شروع ہی سے میرے داہنے پستان کی رگیں خشک تھیں اور اس میں کبھی بھی دودھ نہیں اترا تھا۔ اس نومولود کے اصرار کی وجہ سے میں نے اپنا داہنہ پستان بچے کے منہ میں رکھدیا۔ جیسے ہی اس بچے نے دودھ حاصل کرنے کی کوشش شروع کی میرے اس خشک پستان میں دودھ اتر آیا۔ اس واقعہ سے صرف میں ہی نہیں بلکہ سبھی لوگ غیر معمولی حیرانی میں مبتلا ہوگئے۔

اس کے بعد وہ دایہ کہتی ہے:

''جس روز میں محمد کو اپنے گھر لائی اس دن سے میرے گھر میں خیروبرکت میں روز بروز اضافہ ہوتا چلا گیا اور میری ملکیت پہلے سے بہت زیادہ ہوگئی۔''

۶۱۰ء میں چالیس سال کی عمر میں خداوند عالم کی جانب سے وحی نازل ہوئی اور وہ خداوند عالم کے آخری پیغمبر کی حیثیت سے اسلام جیسے دین کامل کے ساتھ عہدۂ رسالت پر فائز ہوگئے۔

قرآن مجید ان کے نبوت کی دلیل اور وہ عظیم معجزہ الٰہی ہے جو ۱۴۰۰ سال گزرنے کے بعد آج بھی ہر طرح کی تحریف سے پوری طرح محفوظ ہے۔

اگرچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام برسوں قبل خداوند عالم کے حکم کی پیروی کرتے ہوئے پرچم توحید بلند کر چکے تھے لیکن خود ان کی زندگی میں نیز ان کے بعد آنے والی صدیوں کے دوران بعض لوگ اپنے خود ساختہ دین کی پیروی کرتے ہوئے ایسی راہ وروش پر گامزن ہوگئے تھے جو محض ان کے دین کی پیداوار تھی۔

ایک جماعت نے خداوند عالم کو اس کی مخلوقات سے تشبیہ دینا شروع کردیا اور اپنے ذہن کے سانچے میں یہ عقیدہ ڈھال لیا کہ خداوند عالم جسم وجسمانی اعضا کا حامل ہے۔

دوسری جماعت نے خداوند عالم کے نام میں تصرف کرنا شروع کردیا۔ ان میں حجاز کے وہ مشرک اور بت پرست شامل ہیں جو ''لات'' کو اللہ اور ''عزی'' کو عزیز سے منسوب کرتے تھے۔

خود کو دانشور اور روشن خیال کہنے والے بعض گروہ چاند سورج، ستارہ اور جن کی پرستش میں سرگرم ہوگئے۔

لیکن اس دور کی اکثریت نے سال کے ۳۶۵ دنوں کی تعداد کے مطابق قبائلی اور خاندانی بتوں کو تراش لیا تھا اور ہر روز رونما ہونے والے حوادث کو اس روز سے منسوب بت کا کرشمہ قرار دینے لگے۔ اس زمانے میں بت پرستی درحقیقت عبادتی پہلو کی حامل نہ تھی بلکہ ابتدائی مرحلہ میں لوگ بتوں کو فقط اپنا شفیع تصور کرتے تھے۔

دھیرے دھیرے یہ لوگ آگے بڑھے اور وہ وقت بھی آگیا کہ لوگ ان بتوں کو صاحب قدرت سمجھنے لگے اور اس کے بعد مذہب بت پرستی رائج ہوا پس آخری دین کی حیثیت سے لوگوں کو توحید پرستی کی طرف دعوت دینا اور انسانوں کی خوابیدہ، فطرت کو بیدار کرنا، بت پرستی کے خلاف مسلسل جدوجہد میں سرگرم رہنا اور دنیا میں عدل وانصاف قائم کرنا ہی پیغمبر کی

بعثت کا بنیادی مقصد اور مذہب اسلام کا حقیقی پیغام بن گیا۔

خداوند عالم کی مقدس کتاب قرآن اور پیغمبرؐ اسلام نے دنیا کے لاکھوں خوابیدہ ذہن وخوابیدہ ضمیر لوگوں کو غیر معمولی بیداری سے مالامال کردیا۔ جی ہاں! یہ اسلامی بیداری کا کرشمہ نہیں تو اور کیا ہے کہ طلوع اسلام سے قبل جس معاشرہ میں عورتوں کو پیدا ہوتے ہی زندہ در گور کردیا جاتا تھا، اس معاشرہ میں خواتین کے حقوق کی حفاظت اور یتیموں کی پرورش وسرپرستی کا عام چرچا ہونے لگا۔

طلوع اسلام سے پہلے کی لوٹ کھسوٹ کہاں اور اسلام کے بعد انسانی معاشرہ میں رائج ایثار ومہربانی کا رجحان کہاں!

اسلام سے قبل لکڑی اور پتھر کے خود ساختہ بتوں کی پرستش کہاں اور ظہور اسلام کے بعد خدائے وحدہٗ لاشریک اور قادر ورحیم کی طرف وہ ہمہ تن توجہ کہاں جو انسانی عقل وفطرت سے پوری طرح ہم آہنگ ہے۔

جی ہاں!

دنیائے انسانیت جہالت اور نادانی کے بھنور میں پوری طرح گرفتار تھی۔ علم وصنعت کے بارے میں لوگوں کی اطلاعات محدود تھیں اور دور دور تک تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ ایسے گھٹن کے ماحول میں دنیائے بشریت کے آسمان پر اسلام کا آفتاب نمودار ہوا جس نے نہ صرف پوری دنیا کو تابناک ومنور کر دیا بلکہ لوگوں کو علم وصنعت کی طرف بھی مائل کردیا۔ اس نورانی دین نے حصول علم ودانش کو واجب قرار دیتے ہوئے اپنے ماننے والوں سے مطالبہ کیا کہ وہ علم وصنعت کے میدان میں زیادہ سے زیادہ مہارت حاصل کرنے میں ہمہ تن سرگرم رہیں کیونکہ علم کا سرمایہ جمع کرنا امر واجب ہے۔

اسلام نے اپنے ماننے والوں کو حکم دیا کہ ستاروں کے بارے میں غور وفکر اور تحقیق ومدقیق سے کام لیں، حیوانوں اور دریاؤں کا تحقیقی مطالعہ کریں اور پرندوں اور بادلوں کے سلسلے

میں بھی غور وفکر سے کام لیں۔

اگر چہ ''قوت کشش کی تحقیق'' کو نیوٹن سے جوڑتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ نیوٹن نے درخت کی اونچائی سے سیب کے زمین پر گرنے کی وجہ سے ''قوت کشش'' کی تحقیق کا کارنامہ انجام دیا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ نیوٹن سے ۶۰۰ سال قبل ایک مسلمان دانشمند ''الھکیم'' نے ''قوت کشش'' کے نظام کو بخوبی سمجھ لیا تھا اور نیوٹن سے ۴۰۰ سال قبل مسلمان فلاسفہ قوت کشش کے سلسلے میں اپنی واضح تحقیق پیش کر چکے تھے۔

قوت کشش، زمین کی گولائی اور مخلوقات ونباتات کی زوجیت وغیرہ کا علم قرآنی آیات سے ہوتا ہے اور دنیا میں سب سے پہلے مسلمانوں نے زمین کے گول ہونے اور اپنے محور پر اس کی لگاتار گردش کا علم حاصل کیا اور یہ مسلمان ہی تو تھے جنہوں نے علم نجوم کو سمجھا اور اسے سنوار کر دنیا والوں کے سامنے پیش کیا۔

مسلمانوں نے علم کے مختلف شعبوں میں اپنے معاصرین پر سبقت حاصل کی اور یورپ والوں کو حیرت زدہ کر دیا۔ یورپ میں سب سے پہلا میڈیکل کالج مسلمانوں کے ذریعہ اٹلی کے سلونو نامی شہر میں قائم کیا گیا تھا جبکہ اس زمانے میں اسلامی دنیا میں جگہ جگہ پر طبی درسگاہیں موجود تھیں۔

اسلام نے مادیات کے سلسلے میں اتنا غور نہیں کیا کہ معنویات کو بالکل فراموش کر دے اور نہ محض ایسی معنویت کو ہی غور وفکر کا مرکز قرار دیا ہے کہ نفسانی خواہشات کی سرکوبی کے سلسلے میں مبالغہ آرائی کی حد سے گزر جائے۔

اسلام نے ان دونوں نظریات کے سلسلے میں درمیانی راہ وروش سے کام لیا ہے۔ نہ وہ جنسی عزائم پر ایسی محدودیت وپابندی عائد کرتا ہے کہ انسان اپنی فطری خوشی اور سرگرمیوں سے محروم ہوجائے۔ اس کی زندگی بے مزہ ہوجائے اور وہ رہبانیت کی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہوجائے۔

اسلام جسم اور روح کے درمیان توازن قائم کرتا ہے۔ اسلام انفرادی حقوق کا احترام کرتا ہے اور ساتھ ہی سماجی حقوق کو بھی محترم تسلیم کرتا ہے۔ جسم اور روح دونوں میں سے ہر ایک میں لذتیں موجود ہیں اور انسان کا کمال یہ ہے کہ وہ دونوں کو توازن کے ساتھ اپنائے رہے۔

اسلام مذہب زندگی ہے اسی وجہ سے وہ محض معدودے چند انفرادی واجبات اور محرمات پر ہی اکتفا نہیں کرتا ہے بلکہ اس کا اصل مقصد وبنیادی منصوبہ ایک آباد اور محفوظ معاشرہ کی تعمیر وتشکیل ہے۔

اسلام سالم اور سعادت بخش زندگی کے بلند ترین معیاری آئین قوانین کا حامل ہے۔

اسلام ایک وسیع اور گرانقدر منصوبے کا حامل ہے جو گہوارہ سے لیکر قبر تک زندگی کے ہر شعبہ میں انسان کی خوشی کی زمین ہموار کرتا رہے۔

اسلام درحقیقت انسانی زندگی کے جملہ انفرادی اور اجتماعی پہلوؤں کا حامل ہے۔

اسلام انسان کو اہمیت کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ یہ وہ مذہب ہے جو بنی نوع انسان کے درمیان برادری اور برابری کا تصور پیدا کرتا ہے کیونکہ دنیا کے تمام انسان ایک خدا کی مخلوق ہیں۔

اسلام وہ دین ہے جس کی عبادات نہایت سادہ اور انسانی عقل سے میل کھاتی ہیں۔ یہ عبادت و بندگی کو انسان کی بھلائی کا وسیلہ قرار دیتا ہے اور گناہ کو انسانی دنیا کے لئے نہایت نقصان دہ حیثیت سے پیش کرتا ہے۔ لوگوں کو عدل وانصاف کی طرف مدعو کرتا ہے اور ظلم وناانصافی اور دوسروں کے خلاف حملہ وتجاوز سے پرہیز اختیار کرنا سکھاتا ہے۔

اسلام وہ دین ہے جو اپنے پیروکاروں کو اس خدا کے احکام کی پیروی کا حکم دیتا ہے جو جمالیات کا خالق ہے۔ یہ وہ دین ہے جو اپنے ماننے والوں کو لڑائی جھگڑا، تفرقہ واختلاف اور پراگندگی وانحراف سے علیحدگی اختیار کرنے کی تلقین کرتا ہے۔

حصول علم کے سلسلے میں اسلام کسی سرحد کا قائل نہیں ہے بلکہ وہ علم ودانش کو بہترین میراث قرار دیتا ہے۔ اسلام علماء اور دانشمندوں کے سلسلے میں غیر معمولی احترام کا قائل ہے اور عالموں کو زاہدوں سے زیادہ صاحب فضیلت حیثیت سے پیش کرتا ہے۔

اسلام سن رسیدہ افراد اور بزرگان معاشرہ کے لئے غیر معمولی عزت واحترام کا قائل ہے اور ان لوگوں کو بڑی عزت کی نظر سے دیکھتا ہے۔

اسلام مسلمانوں پر یہ ذمہ داری عائد کرتا ہے کہ وہ لوگوں کے اعمال پر نگاہ رکھیں اور انہیں نیکی کی طرف مدعو کرتے ہوئے برائیوں سے دوری اختیار کرنے کا مشورہ دیں۔ اسلام لوگوں کو یہ حکم دیتا ہے کہ اگر تم واقعی ایک آباد اور خوشحال معاشرہ کے متمنی ہو تو تم فساد سے دوری اختیار کرتے ہوئے عمومی نظارت کو لازم خیال کرو۔ درحقیقت اسلام صحیح اور منطقی تنقید کو اصلاحات کی کنجی قرار دیتا ہے۔

اسلام مسلمانوں کو حکم دیتا ہے کہ ایک دوسرے کو پند ونصیحت کرنے میں کوتاہی نہ کرو۔

اسلام خانوادہ اور اولاد کی تربیت کو بڑی اہمیت دیتا ہے۔

اسلام والدین کی اطاعت کا ذکر خداوند عالم کی اطاعت فرمانبرداری کے ساتھ کرتا ہے اور ماں باپ کے ساتھ حسن سلوک کو واجب سمجھتا ہے۔

اسلام مسلمانوں پر یہ فریضہ عائد کرتا ہے کہ مومنین کی ضروریات کے سلسلے میں اپنی ذمہ داریوں کا احساس کریں۔

اسلام ان سماجی امور خیر کو غیر معمولی اہمیت دیتا ہے جس سے عام لوگوں کو فائدہ پہونچتا ہے۔ اسلام ظالموں کو دھمکی دیتا ہے اور ان کے خلاف جدوجہد اور نبرد آزمائی کو لازم قرار دیتا ہے۔

اسلام مسلمانوں کے درمیان الفت اور دوستی کی ایجاد کو بنیادی ترین کاموں میں شمار

کرتا ہے۔

اسلام عفو و درگزر اور مہربانی چشم پوشی پر تاکید کرتا ہے اور منافقت ودوئی سے پرہیز اختیار کرتا ہے۔

اسلام اپنے ماننے والوں کو سچ بولنے کی دعوت دیتا ہے اور نجات کو سچائی میں مضمر وپوشیدہ مانتا ہے۔ لوگوں کو امانت داری اور درست کاری کی دعوت دیتا ہے اور بیماروں کی عیادت کو اپنی عبرت وانکی تسلی وتسکین کا باعث قرار دیتا ہے۔

اسلام مسلمانوں کو خوش کرداری وخوش روی کی طرف مدعو کرتا ہے۔ حسن اخلاق کو مسلمانوں کے لئے واجب ولازم قرار دیتا ہے اور وعدہ کو پورا کرنے پر تاکید کرتا ہے۔

اسلام نوجوانوں کو شادی کرنے کی ترغیب دیتا ہے اور ان کی خاطر خواہ حوصلہ افزائی بھی کرتا ہے اور گوشہ نشینی وتنہائی پسند زندگی پر ملامت کرتا ہے۔

اسلام نظافت وبہداشتی کے سلسلے میں غیر معمولی اہمیت کا قائل ہے اور اس سلسلے میں بیشمار احکام موجود ہیں۔

اسلام رہبانیت سے پرہیز اور دنیا پرستی کی شدت کے ساتھ نفی وتردید کرتا ہے۔

اسلام مسلمانوں سے یہ مطالبہ کرتا ہے کہ وہ دنیا کی خاطر آخرت کو فراموش نہ کریں اور دنیا کو آخرت پر قربان بھی نہ کریں بلکہ دنیا وآخرت کی خوبیوں کو جمع کرنے کی کوشش کریں۔

اسلام عزیزوں کی حفاظت ونگہداری کو تمام مسلمانوں کا دینی فریضہ قرار دیتا ہے۔

اسلام مہمان نوازی پر بہت زور دیتا ہے اور اس کو اخلاقی محاسن کا حصہ قرار دیتا ہے اور یتیموں کی سرپرستی کا حکم دیتا ہے۔

اسلام انسان کے احترام کا قائل ہے چاہے وہ زندہ ہو یا موت سے ہم آغوش ہو چکا ہو۔

واضح رہے کہ اسلام مردہ شخص کے جنازہ کی بے احترامی کی اجازت نہیں دیتا ہے۔

اسلامی احکام کا سرچشمہ وحی خداوندی ہے لہذا اس میں کسی خطا ولغزش کی کوئی گنجائش نہیں رہ جاتی۔ اسلام حق اور آزادی کا علمبردار ہے اور عدالت وبرابری کی آواز بلند کرتا ہے۔

اسلام جاہلانہ تعصبات، نسلی امتیازات اور طبقاتی اختلافات کی تردید کرتا ہے۔

اسلام دین عقل وفطرت ہے۔

اسلام خداوند عالم کا آخری اور کامل ترین دین ہے جس کو خداوند عالم نے دنیائے انسانیت کی ہدایت ورہنمائی کے لئے اس دنیا میں بھیجا ہے۔

مذہب اسلام میں انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے تمام پہلوؤں سے وابستہ مکمل اور نورانی احکام موجود ہیں اور صحت وسلامتی بشر کے سلسلے میں بھی یہ مذہب مفید احکامات سے پوری طرح مالامال ہے۔

البتہ یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ ہر قول وعمل کے درمیان گہرا فاصلہ ہوا کرتا ہے۔ اس بات کا قوی امکان ہے کہ کوئی شخص یا معاشرہ اسلام کے سلسلے میں لمبے لمبے اعلانات شائع کررہا ہو لیکن عمل کے میدان میں اس نے اسلام کی نورانیت سے ذرہ برابر بھی فائدہ حاصل نہ کیا ہو اور محض مسلمان نام رکھ لینے میں ہی مگن ہو۔

اس دنیا میں ہی نہیں بلکہ موت کے بعد بھی انسان کی نجات وسعادت کا واحد راستہ حقیقی اسلام کی پیروی ہے۔

مختصر لفظوں میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ اسلام جمالیات کا مذہب ہے اور جمالیات کی طرف مدعو کرتا ہے کیونکہ وہ صاحب جمال انسانوں کا خالق اور خود بھی صاحب جمال ہے۔

☆☆☆☆☆

عقائد شناسی:

پروفیسر سید جعفر رضا

اسلامی فرقے

(قسط ۳)

فرقۂ اہل تسنن:

یہ فرقہ مسلمانوں کا سوادِ اعظم ہے، جس کا پورا نام اہل السنّت والجماعت ہے۔ اس نام سے واضح ہوتا ہے کہ اس فرقہ میں سنت نبوی اور جماعت یعنی صحابہ خصوصاً شیخین، دونوں پر اعتماد رکھنا لازمی شرطیں ہیں۔ سنت نبوی اور سنت شیخین کو اسلامی عقیدہ میں اساس بنانے کی اختراع حضرت عبد الرحمٰن بن عوف کی تھی، جو حضرت عثمان کے سگے بہنوئی تھے اور حضرت عمر فاروق کے بعد قیام خلافت کی شوریٰ کے رکن تھے اور حضرت عثمان کی خلافت قائم کرنا چاہتے تھے، اس لیے انھوں نے ایک ایسی شرط رکھی جو حضرت علی کے لیے قابل قبول نہ ہو۔ انھوں نے حضرت علی سے کہا کہ آپ وعدہ کریں کہ کتاب، سنت رسولؐ اور سنت شیخین (سنت حضرت ابو بکر صدیق اور سنت حضرت عمر فاروق) پر عمل پیرا ہوں گے۔ حضرت علی کا جواب تاریخ کی زینت ہے۔ ''میں کتاب وسنت پر عمل کروں گا، اگر سنت شیخین کتاب وسنت کے مطابق ہے تو الگ سے کسی شرط کی ضرورت نہیں ہوسکتی، میں بھی پابند رہوں گا۔ اگر سنت شیخین کتاب وسنت رسول سے الگ ہے تو کسی مسلمان کو قبول نہیں کرنا چاہیے''![1] حضرت علی خلافت سے محروم ہوگئے اور حضرت عثمان نے السنّت والجماعت کا حلف لے لیا۔ یہ واقعہ ۲۳ھ/ ۶۴۴ء کا ہے اس طرح اسی سال کو فرقہ اہل السنّت والجماعت کے قیام کا سال کہہ سکتے ہیں۔ اور حضرت عثمان ہی اولین اہل السنّت والجماعت ہوئے۔ لیکن یہ نام اس وقت چل نہیں سکا۔

حضرت عثمان کے حامیوں کو 'شیعیان عثمان' یا اموی کہا جاتا رہا۔ البتہ مخالفین اس جماعت کو 'ناصبی' کہتے تھے جس کے معنی باغی کے ہوتے ہیں ۔فرقہ اہل السنّت والجماعت کا نام پہلی بار عباسی خلافت میں منصور کے دور حکومت (۸۰۹۔۷۸۶ء) میں رائج ہوا۔ ۲

فرقہ اہل السنّت والجماعت کی فقہی پہچان قیام خلافت عباسی (۱۳۲ھ/۷۵۰ء) سے قبل نہیں ملتی ، حالانکہ اس وقت دیگر اسلامی فرقوں میں اہل تشیع، خوارج ، مرجئہ اور معتزلہ نہ صرف یہ کہ وجود میں آچکے تھے بلکہ ان کے درمیان مختلف ومتنوع فقہی مسائل ومباحث پر گرما گرم بحثیں جاری تھیں۔فرقہ اہل السنّت والجماعت کے فقہی موسس امام اعظم ابو حنیفہ (۱۵۰ھ/ ۷۶۷ء) خود ہی اہل تشیع کے تربیت یافتہ تھے، انھیں کے درمیان سے ابھرے اور خاندانی طور پر اہل تشیع میں سے تھے۔ ابن خلکان نے ان کا نام ونسب یہ بتایا ہے: نعمان بن ثابت بن زوطی بن ماہ۔ ۳ زوطی لقب اور نعمان نام بتایا ہے۔ زوطی جاٹ کی تعریب ہے۔ اسی بنیاد پر کہتے ہیں کہ امام ابو حنیفہ ہندی الاصل تھے۔ زوطی حضرت علی کے ہدیہ گذاروں میں تھے ۴ امام ابو حنیفہ کے "والد کا انتقال صغرسنی میں ہوگیا اور اس کے بعد ان کی والدہ نے امام جعفر صادق سے نکاح کرلیا۔ لہٰذا ان کی تربیت امام عالی مقام کی نگرانی میں ہوئی۔" ۵ خلافت عباسی نے کوفہ کو دار الخلافہ قرار دیا تو اس سے اہل تشیع اپنا ایک مرکز کھو بیٹھے۔ ان میں سے اکثر لوگ تقیہ میں چلے گئے۔ اور بعضوں نے عباسیوں کی ہم نوائی شروع کردی۔ امام جعفر صادق (م: ۱۴۸ھ/ ۷۶۵ء) کے شاگردوں میں امام ابو حنیفہ کے علاوہ امام مالک بن انس ، سفیان بن عیینہ، سفیان ثوری ، شعبہ بن حجاج ، فیصل بن عیاض وغیرہ استاد سے الگ ہوکر اپنے اپنے فقہی افکار میں ممتاز ہوکر الگ الگ دبستانوں کے بانی قرار پائے۔فرقہ اہل السنّت والجماعت کے عقاید اور اصول دین کی تاسیس امام ابو حنیفہ کے ہاتھوں سر انجام ہوئی۔ مولانا ابو الاعلیٰ مودودی بھی تسلیم کرتے ہیں : "امام ابو حنیفہ پہلے شخص ہیں ، جنھوں نے فقہ الاکبر لکھ کر ان مذہبی فرقوں کے مقابلہ میں عقیدہ اہل السنّت والجماعت کو ثبت کیا۔" ۶

گذشتہ صفحات میں ذکر آچکا ہے کہ فرقہ اہل تشیع اور فرقہ اہل تسنن کے مابین اصل اختلاف نص امامت وخلافت پر ہے، پھر دیگر اہم سوال اٹھتے ہیں۔ مثلاً ایمان کی تعریف، ایمان وکفر کے درمیان تفریق، گناہ کے اثرات ونتائج وغیرہ۔ چونکہ امام ابوحنیفہ شیعیت کی راہ سے سنیت کی جانب گئے تھے لہٰذا موصوف کے افکار وعقاید پر مفاہمتی رجحان غالب ہے۔ اسی مفاہمتی رجحان کے تحت اہل تشیع ،خصوصاً مسلک امامیہ، کی جانب نصف سے زیادہ راہ مسافت طے کر کے آئے۔ آئمہ اہل بیت کی بزرگی وعظمت قبول کی۔ حضرت علیؓ کو زیادہ محبوب رکھا۔ بے ارکان دین مسلک امامیہ کی طرح رکھے حتیٰ کہ نماز میں درود وسلام محمد وآل محمد پر ختم کیا، نہ اس میں اصحابہ شامل ہوئے، نہ ازواجہ۔ ۵ حضرت عثمان کو حضرت علیؓ پر ترجیح نہیں دیتے تھے۔ ۹ محض اولین دو خلافتوں کے حق مان لینے پر مکمل مفاہمت ہوسکتی تھی۔ لیکن اہل تشیع کا معاملہ مختلف تھا۔ وہ اپنی جگہ سے جنبش نہ کرسکتے تھے، نہ انھوں نے کیا ع! اگر زمام اختیار ہاتھ میں ہوتی تو وہ بھی آگے بڑھتے لیکن ان کے نزدیک امامت یا خلافت کی نص کے لیے جمہور کی رائے کو دخل نہیں ہوسکتا۔ وہ تو منصوص من اللہ ہے اور جس کو اللہ تعالیٰ منتخب نہ کرے، اس کو منتخب کرنے والے یا اس کے حق پر ہونے کی گواہی دینے والے اہل تشیع کیونکر ہوسکتے تھے۔ بس اتنے پر معاملہ رک گیا۔ مسلک زیدیہ نے اسے قبول کرلیا تو اہل تسنن نے انھیں گلے سے لگالیا۔

حضرت علیؓ اور ائمہ اہل بیت کے متعلق امام ابوحنیفہ کی یہ محض ذاتی رائے نہیں تھی بلکہ اسی کو اہل تسنن کا اجتماعی عقیدہ قرار دیا جاسکتا ہے۔ چند انتہاپسندوں سے قطع نظر ہنوز اہل تسنن حب علیؓ واہل بیت کو شرط ایمان مانتے ہیں:

من علیؓ را دوست دارم خلق گوید رافضی
پس خدا و مصطفیٰ جبریل باشد رافضی

یہ محض شاعرانہ خیال نہیں ہے امام شافعی کے مشہور شعر پر مبنی ہے:

ان کان رفضاً حب آل محمد
فاشهد الثقلان انی رافض

(اگر آل محمد کی محبت کا نام رافضیت ہے تو انس وجن گواہ رہیں کہ میں رافضی ہوں)

اسی خیال کو مولانا ضیاء احمد بدایونی نے اردو قالب عطا کیا ہے:

گر رفض ہے یہی کہ محبّ علیؑ ہوں میں
جن وبشر گواہ رہیں رافضی ہوں میں

اس میں شک نہیں کہ حب علیؑ واہل بیت ہی وہ اساسی نکتہ ہے، جس کی معنویت نہ صرف یہ کہ ہنوز برقرار ہے بلکہ اس نکتہ پر وحدت اسلامی کا خواب شرمندہ تعبیر ہوسکتا ہے۔

مجموعی اعتبار سے اہل سنت والجماعت کے عقاید وافکار کے دو طور ہیں۔ اصول دین میں الاشاعرہ کی پیروی اور فروع (ارکان) دین میں مسالک (حنفی، مالکی، شافعی، حنبلی) میں سے کسی ایک کی پیروی۔ انھیں بنیادوں پر اہل تسنن کے مختلف مسالک جزوی اختلافات کے باوجود ہنوز عمل پیرا ہیں۔

اولاً، خلفائے راشدین کے بارے میں:

خلافت یا امامت کو جمہور کی رائے کا پابند بنانے کی صورت میں کئی بنیادی مسائل پیدا ہوتے ہیں۔ مثلاً خلیفہ کی تقرری کا آئینی طریقہ کیا ہوگا؟ اہلیت خلافت کی شرائط کیا ہوں گی؟ فاسق وظالم خلیفہ ہوسکتا ہے یا نہیں؟ عدلیہ وانتظامیہ کا معیار کیا ہوگا؟ ان کے درمیان کن بنیادوں پر توازن قائم ہوسکتا ہے۔ بیت المال کے قوانین وغیرہ پھر دوسری نوعیت کے مسائل بھی تھے۔ اگر کسی کی خلافت صحیح نہیں ہو یا مشکوک ہو تو اس کے فیصلے قانون اسلامی کا جز قرار پائیں گے یا نہیں؟ اس کے فیصلوں کو قانونی نظائر میں شمار کیا جائے گا یا نہیں؟ اگر اس کا کردار وعمل عدل وانصاف کے منافی ہے تو اس شخص کے ذریعہ رسول اللہؐ کے جو احکامات منقول ہوئے، ان کو کہاں تک پایہ اعتبار، حاصل ہوگا؟

اہل تسنن میں خلیفہ کی تقرری کا آئین کیا ہو، دشوارترین مسئلہ ہے۔ کیونکہ ہر بار الگ الگ اصول کے مطابق خلیفہ کا تقرر ہوا۔ خلافت اول کا انعقاد جمہور پر ہوا۔ حضرت ابو بکر صدیق (: ۱۳ھ ، ۶۳۴ء) اتفاق جمہور کے اتنے پابند رہے کہ چھ ماہ تک فیصلے کرنے سے اس وقت تک رکے رہے جب تک اہل یمن کی بیعت نہ آگئی۔ [۱] لیکن انھوں نے اپنے بعد انتخاب خلیفہ کا حق جمہور کو عطا کرنے کے بجائے ، اپنی خلافت کے محرک اور دست راست حضرت عمر بن خطاب کو جانشین مقرر کردیا۔ جمہور نے نامزدگی کے بعد بیعت کی۔ انتخاب میں جمہور کو دخل نہ تھا۔ حضرت عمر فاروق نے انتخاب خلیفہ کا حق نہ جمہور کو عطا کیا، نہ کسی کے حق میں وصیت کی بلکہ اس کا فیصلہ ایک شوریٰ مقرر کرکے ، اس کے سپرد کردیا۔ اس طرح تیسری خلافت ایک نئے اصول کے مطابق قائم ہوئی۔ اگر اس شوریٰ کا قیام جمہور کے ذریعہ ہوا ہوتا ، تو اس فیصلہ کو جمہوری قراردینے کی تاویل ہوسکتی تھی لیکن اس بار فیصلہ یکسر مختلف طریقہ پر ہوا، عبدالرحمٰن بن عوف نے ازخود ایک شرط اختراع کی، کتاب سنت اور سنت شیخین سے متعلق ، جس کا ذکر اوپر کی سطروں میں آچکا ہے، چوتھی بار خلافت عالم انتشار میں ہوئی۔ جمہور نے فیصلہ کیا، لیکن یہ فیصلہ یقیناً دباؤ کا فیصلہ تھا۔ باہر سے آکر لوگوں نے دہشت گردی کی، جس کے نتیجہ میں خلیفہ وقت کو جان کھونا پڑی، غالباً اسی بنا پر جب لوگوں نے حضرت علیؑ پر خلافت قبول کرنے کے لئے دباؤ ڈالا تو انھوں نے مسجد میں اعلان عام کی شرط رکھی، مسجد میں مسلمان یکجا ہوئے اور حضرت علیؑ کے ہاتھوں پر بیعت کی۔

ان مختلف ومتضاد اصولوں پر وجود میں آئی خلافتوں کو عصری اکابرین اہل السنّت والجماعت میں مولانا ابو الاعلیٰ مودودی ، مولانا ابوالحسن ندوی وغیرہ جمہوریت قراردیتے ہیں [۱۱] اور جمہوریت کے مسلّمہ عناصر کو نظر انداز کردیتے ہیں ۔ جمہوریت عوامی حاکمیت (Popular Sovereignty) کے اصول پر قائم ہوتی ہے جبکہ اسلامی نظام خلافت میں جمہور کے بجائے اللہ تعالیٰ کی حاکمیت تسلیم کرنا پڑتی ہے۔ خواہ برضا ورغبت، خواہ بجبر واکراہ۔ جمہور کو اپنے تیار

کردہ قوانین کے بجائے الٰہی قانون کے حدود میں کام کرنا ہوتا ہے۔ جمہوری حکومت میں سیاسی فیصلے عوام یا ان کے منتخب نمائندے اکثریت کے اصول پر کرتے ہیں۔ زیادہ تر فیصلے عوام کے منتخب نمائندوں کی کونسل کرتی ہے۔ جس کے لئے منتخب نمائندوں کو جواب دہ ہونا پڑتا ہے۔ جمہوریت یونانی طرز فکر ہے۔ ۱۲

مولانا شیخ اشرف علی تھانوی جمہوریت کو اسلامی افکار میں شامل کرنے کے سخت خلاف تھے، لکھتے ہیں: ”بعض لوگوں کو یہ حماقت سوجھی ہے کہ وہ جمہوری سلطنت کو اسلام میں ٹھونسنا چاہتے ہیں اور دعویٰ کرتے ہیں کہ اسلام میں جمہوریت ہی کی تعلیم ہے اور استدلال میں آیت پیش کرتے ہیں کہ وشاورھم فی الامر (اور ان سے خاص خاص باتوں میں مشورہ لیتے رہا کیجئے) مگر یہ بالکل غلط ہے۔ ان لوگوں نے مشورے کی دفعات ہی کو دفع کردیا اور اسلام میں مشورے کا جو درجہ ہے اس کو بالکل نہیں سمجھا۔ ...اور انتظامیہ متعلقہ بالرائے میں کثرت رائے کا ضابطہ محض بے اصل ہے ورنہ عزم میں یہ قید ہوتی بشرطیکہ آپ کا عزم کثرت رائے کے خلاف نہ ہو۔“ ۱۳

انعقاد خلافت میں پہلے اقتدار پر قبضہ ہونا اور بعد میں مسلمانوں سے بیعت حاصل کرنا، دو صورتوں میں ممکن ہے ایک، بزور طاقت اور دوسرے عام رضا مندی سے۔ اہل تسنن میں اس کے دو مکتب خیال ہیں۔ امام ابو حنیفہ کے نزدیک پہلے بزور اقتدار پر قبضہ کرنا، پھر بعد میں دباؤ ڈال کر بیعت لینا جائز نہیں ہوسکتا لیکن امام مالک کے نزدیک خلافت قائم ہوجانے کے بعد جائز ہے۔ ان دونوں صورتوں کی تائید عباسی خلیفہ المنصور (م: ۷۷۵ء) کے حاجب ربیع بن یونس کے بیان سے ہوتی ہے کہ اس نے امام ابو حنیفہ اور امام مالک کو بلا کر پوچھا کہ جو حکومت اللہ تعالیٰ نے اسے عطا کی ہے، کیا وہ اس کا اہل ہے۔ امام ابوحنیفہ نے جان کی پروا کیے بغیر کہا۔ آپ اس طرح خلیفہ بنے ہیں کہ آپ کی خلافت پر اہل فتویٰ سے دو آدمیوں کا اجماع بھی نہیں ہوا، حالانکہ خلافت مسلمانوں کے اجماع اور مشورے سے ہوتی ہے۔ امام

مالک نے دل خوش کن جواب دیا۔ اگر آپ اسکے اہل نہ ہوتے تو اللہ تعالیٰ اپنی خلافت آپ کے سپرد نہ کرتا۔ ۱۴

اہل تشیع کے نزدیک امام کو راسخون فی العلم ہونا چاہئے۔ ۱۵ لیکن اہل تسنن کے نزدیک راسخون فی العلم ہونا ضروری نہیں ہے، البتہ تین دیگر مسائل بحث طلب لاتے ہیں، جو یہ ہیں..... اولاً خلفاء میں أفضل الناس کون ہے؟ ثانیاً، ظالم وفاسق خلیفہ ہوسکتا یانہیں؟ اور ثالثاً کیا خلافت کے لئے قرشی ہونے کی شرط لازمی ہے؟ أفضل الناس کے مسئلہ پر اہل تسنن کی اکثریت بشمول صوفیہ بعد رسول حضرت علی کے حق میں رہی ہے، جن کے متعلق احادیث واقوال سے کتابیں بھری پڑی ہیں۔

امام ابو حنیفہ کے اقوال میں راقم کو کہیں بھی کسی دیگر خلیفہ کے أفضل الناس ہونے کا ذکر نہیں ملا بلکہ حضرت علیؓ سے والہانہ شیفتگی کی متعدد مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں۔ ۱۶ البتہ اسی مسلک کے امام طحاوی (م: ۳۲۹ھ/ ۹۳۳ء) أفضل الناس کی ترتیب بہ اعتبار خلافت دیتے تھے۔یعنی پہلے حضرت ابو بکر، پھر حضرت عمر۔ پھر حضرت عثمان اور پھر حضرت علی۔ انھوں نے یہ درج کیا: "اور یہ خلفائے راشدین وائمہ مہدیین ہیں" ۱۷ ظالم وفاسق کے خلیفہ ہونے یا نہ ہونے کا مسئلہ خلافت راشدہ کے بعد کے ادوار سے متعلق ہے جن کی اکثریت قرآنی حکم: لاینال عهدی الظالمین (یہ عہدہ امام ظالمین تک نہیں جائے گا۔ البقرہ ۲: ۱۲۴) کی صریحی خلاف ورزی کرکے وجود میں آئی۔

امام ابو حنیفہ نے فرمایا "مومنوں میں ہر نیک وبد کے پیچھے نماز جائز ہے۔" ۱۸ اس سے ان پر الزام لگا کہ وہ فاسق وظالم کی امامت کو جائز قرار دیتے ہیں۔ ۱۹ اس پیچیدہ مسئلہ پر حنفی مسلک کے مشہور امام ابو بکر الجصاص نے فتویٰ صادر کیا: "پس جائز نہیں کہ کوئی ظالم شخص نبی یا نبی کا خلیفہ یا قاضی یا کوئی ایسا منصب دار جس کی بناپر امور دین میں اس کی بات قبول کرنا لوگوں پر لازم آتا ہے۔ آیت (لاینالُ عهدی الظالمین) اس بات پر دلالت کرتی ہے

کہ دین کے معاملات میں جن لوگوں کو بھی پیشوائی کا مقام حاصل ہو، ان کا عادل اور صالح ہونا شرط ہے۔ امام ابو حنیفہ کہتے ہیں اور صرف امام ابو حنیفہ ہی نہیں، فقہائے عراق میں سے جن لوگوں کے اقوال معروف ہیں، وہ سب یہی کہتے ہیں کہ قاضی اگر خود عادل ہو تو خواہ وہ ظالم امام ہی کا مقرر کیا ہوا ہو، اس کے فیصلے صحیح طور پر نافذ ہو جائیں گے اور نماز ان فاسق اماموں کے پیچھے بھی، ان کے فسق کے باوجود جائز ہوگی۔ یہ مسلک اپنی جگہ بالکل صحیح ہے مگر اس سے یہ استدلال نہیں کیا جا سکتا کہ ابو حنیفہ فاسق کی امامت کو جائز ٹھہراتے ہیں'' ۲۰ امام ابو حنیفہ امام یا خلیفہ کے لئے قرشی ہونا لازمی شرط قرار دیتے تھے۔

عدلیہ وانتظامیہ اور بیت المال کے متعلق اہل السنّت والجماعت کے عقاید امام ابو حنیفہ نے واضح کیے۔ انھوں نے اپنے شاگردوں کو تاکید کی'' اگر کوئی خلیفہ ایسا جرم کرے جو انسانی حقوق کے خلاف ہو تو مرتبے میں اس سے قریب ترین قاضی (یعنی قاضی القضاۃ) کو اس پر حکم نافذ کرنا چاہیئے۔'' ۲۱ ایک دوسرے موقع پر کہا کہ'' امر بالمعروف ونہی عن المنکر فرض ہے اور رسول اسلام کا ارشاد بیان کیا کہ افضل الشہدا ایک تو حمزہ بن عبد المطلب ہیں۔ دوسرے وہ شخص جو ظالم کے سامنے اٹھ کر نیک بات کہے اور بدی سے روکے او اس قصور میں مارا جائے۔ ۲۲ اسی اصول کے مطابق امام ظالم و فاسق کے خلاف خروج (Revolt) کو ضروری قرار دیتے تھے۔ ۲۳ امام ابو حنیفہ کہتے تھے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ابتدآ زبان سے فرض ہے لیکن اگر سیدھی راہ اختیار نہ کی جائے تو پھر تلوار سے کام لینا واجب ہے۔ ۲۴ بیت المال کے معاملہ میں امام ابو حنیفہ سب سے زیادہ اپنے دور کے خلیفہ پر معترض تھے، جنھوں نے بیت المال کو ذاتی خزانہ بنالیا تھا، جس کو اپنے اور اپنے اراکین دربار کی عشرتوں پر صرف کرتے تھے۔ ان کے نزدیک بیرونی ممالک کے ہدیے اور تحفے جو خلیفہ کے پاس آئیں، مومنین کی چیزیں ہیں۔ وہ بیت المال سے خلیفہ کے بے جا مصارف اور عطیات وغیرہ پر سخت تنقید کرتے تھے۔ ۲۵

ظالم وفاسق خلفاء کے فیصلوں کو اسلامی قانونی نظائر میں شمار کرنے کے متعلق اہل سنت والجماعت کے طریقہ کار کی وضاحت امام ابوحنیفہ کے عزیز ترین شاگرد قاضی ابو یوسف (م: ۱۹۲ھ / ۸۰۷ء) نے کی جو بقول مولانا مودودی: ''ہر معاملہ میں وہ یا تو قرآن وسنت سے استدلال کرتے ہیں، یا پھر نظائر لاتے ہیں تو ابوبکر وعمر اور عثمان وعلی کے دور حکومت سے اور بعد کے خلفاء میں سے اگر کسی کے اعمال کو انھوں نے نظیر بنایا تو وہ المنصور یا المہدی نہیں بلکہ بنی امیہ کے خلیفہ عمر بن عبدالعزیز ہیں۔ اسکے صاف معنی تھے کہ سلطنت مرتب کرتے وقت انھوں نے عمر بن عبدالعزیز کے ڈھائی سال کو مستثنیٰ کر کے) حضرت علی کی وفات سے لے کر ہارون رشید کے زمانہ تک تقریباً ۱۳۲ سال کی حکومت کے پورے رواج وتعامل کو نظر انداز کر دیا۔''[۱۶] یہی رویہ ان احکامات رسول اللہ کے منقول ہونے سے متعلق بھی درست ہوگا، جو خلافت راشدہ کے بعد دیگر ماخذ اور روایات کی بنیاد پر پیش کیے گئے، ان کو پایہ اعتبار نہیں حاصل ہوسکتا۔

ثانیاً، صحابہ کرامؓ کے بارے میں:

اس مسئلہ میں اہل السنت والجماعت کا عقیدہ ہے: الصحابه كله عدول'' (صحابہ سب راست باز ہیں) ۔[۱۷] تمام محدثین، فقہا اور علماء کا عقیدہ ہے ہ صحابہ کرام مسلمانوں تک دین اسلام کے پہنچانے کا ذریعہ ہیں۔ اگر ان کی عدالت میں ذرہ برابر بھی شبہ کیا تو دین ہی مشتبہ ہوجائے گا۔ مولانا مودودی کی وضاحت ہے: ''صحابہ کی عدالت کو اگر اسی معنی میں لیا جائے کہ تمام صحابہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پورے وفادار تھے اور ان سب کو یہ احساس تھا کہ حضورؐ کی سنت وہدایت امت تک پہنچانے کی بھاری ذمہ داری ان پر عاید ہوتی ہے، اس لیے ان میں سے کسی نے کبھی کوئی بات حضورؐ کی طرف غلط طور پر منسوب نہیں کی ہے تو الصحابه كلهم عدول، کی تعبیر بلا استثناء تمام صحابہ پر راست آئے گی لیکن اگر اسکی یہ تعبیر کی جائے کہ بلا استثنا تمام صحابہ اپنی زندگی کے تمام معاملات میں صفت عدالت

سے کلی طور پر متصف تھے اور ان میں سے کسی سے کبھی کوئی کام عدالت کے منافی صادر نہیں ہوا، تو یہ ان پر راست نہیں آسکتی۔'' ۲۸

اس وضاحت کا دوسرا نکتہ صحابہ کے معصوم عن الخطاء ہونے سے متعلق ہے جو اہل تسنن کیا کوئی مسلمان تسلیم نہیں کرسکتا بلکہ دوسرا نکتہ کہ، ان میں سے کسی نے کبھی کوئی بات حضورؐ کی طرف غلط طور پر منسوب نہیں کی بھی محل نظر ہے۔ اس کو صحیح مان لیا جائے تو ہزاروں جعلی ووضعی احادیث کے انبار کو قبول کرلینا ہوگا، جو قرآن وسنت سے مطابقت نہیں رکھتیں بلکہ اسلام کے ان جلیل القدر علماء وفضلا کے کارناموں پر پانی پھیر دینا ہوگا، جنھوں نے علم رجال کو مستقل علم کا درجہ عطا کیا اور وضعی وجعلی احادیث کے سنگ خارہ کے درمیان سے موتی سے زیادہ تابندہ اصلی احادیث پہچان کر الگ کرلیں۔

صحابہ کرام کی عظمت وبزرگی ان کے حسن کردار وعمل، تقویٰ اور تقدس کی بنا پر تھی، کسی وصف اضافی کی بنا پر نہیں تھی۔ حضرت علی ان کی تعریف میں فرماتے ہیں: "لقد رایت اصحاب محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، نما آرای احداً منکم یشبھم لقد کانو یصبحون شعثا غیراً وقد باتواسجدًا وقیاما یدا وحون بین جباھھم وخدودھم ویقفون علی مثل الجمر من ذکر معادھم کان اعیمنھم رکب الممعزی من طول سجودھم اذا ذکر اللہ ھملت اعینھم حتی تبل جیوبھم ومادوا کما یمید الشجر یوم الریح العاصف خوفاً من العقاب ورجاء الثواب'' (میں نے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خاص خاص اصحاب دیکھے ہیں۔ مجھے تو تم میں سے ایک بھی ایسا نظر نہیں آتا، جو ان کے مثل ہو۔ وہ اس عالم میں صبح کرتے تھے کہ ان کے بال بکھرے ہوئے اور چہرے خاک سے اٹے ہوتے تھے۔ جبکہ رات کو وہ سجود وقیام میں کاٹ چکے ہوتے تھے۔ اس عالم میں کہ کبھی پیشانیاں سجدے میں رکھتے تھے اور کبھی رخسار اور حشر کی یاد سے اس طرح بیچین رہتے تھے کہ جیسے انگاروں پر ٹھہرے ہوئے ہوں اور لمبے سجدوں کی وجہ سے ان کی آنکھوں کے

درمیان (پیشانیوں پر) بکرے کے گھٹنوں کی طرح کے گٹے پڑے ہوئے تھے۔ ان کی آنکھوں کے سامنے اللہ کا ذکر آجاتا تھا، تو آنکھیں برس پڑتی تھیں، یہاں تک کہ ان کے گریبانوں کو بھگودیتی تھیں۔ وہ اس طرح کانپتے رہتے تھے، جس طرح تیز جھکڑ والے دن درخت تھرتھراتے ہیں، سزا کے خوف اور ثواب کی امید میں۔) ۲۹؎

حضرت علی کے خلاف جنگ کرنے والے صحابہ کے متعلق امام ابوحنیفہ کا موقف واضح تھا کہ وہ حضرت کے مقابلہ میں حق پر نہیں تھے۔ ۳۰؎ اور ظاہر ہے کہ اس میں جنگ جمل وصفین کے شرکاء شامل ہیں۔ ۳۱؎ حافظ ابن حجر نے بیان کیا ہے کہ یہ تنہا امام ابوحنیفہ کی رائے نہیں تھی بلکہ اس مسئلہ میں تمام اہل سنت والجماعت کا اتفاق ہوچکا تھا۔ ۳۲؎ اتفاق آراء اس حقیقت کے پیش نظر خصوصی معنویت کی حامل ہوجاتی ہے کہ اہل تسنن کے عقیدہ کی اساس السنّت کی طرح الجماعت پر مبنی ہے اور الجماعت سے مراد صحابہ کرام ہیں۔

ثالثاً، ایمان کے بارے میں:

اس مسئلہ میں اہل سنت والجماعت کے عقیدہ کے دو عناصر ہیں۔ اقرار باللسان اور تصدیق بالقلب۔ ۳۳؎ امام ابوحنیفہ وضاحت کرتے ہیں: ''عمل ایمان سے الگ ایک چیز ہے اور ایمان عمل سے الگ۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ بسا اوقات مومن سے عمل مرتفع ہوجاتا ہے مگر ایمان اس سے مرتفع نہیں ہوتا۔ مثلاً یہ کہا جاسکتا ہے کہ فقیر پر زکوٰۃ واجب نہیں مگر یہ نہیں کہا جاسکتا ہے کہ اس پر ایمان واجب نہیں۔'' ۳۴؎ اس دلیل کے منطقی مغالطہ پر بحث کا موقع نہیں، کیونکہ فقیر پر زکوٰۃ واجب نہ ہونے کا حکم اسکی معذوری کی بنا پر ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی بندہ پر ایسا کوئی حکم نافذ نہیں کرتا، جو اس کے مقدور میں ہی نہ ہو۔

ایمان کے بارے میں قول امام علیؑ بن موسیٰ الرضا ہے: ان الایمان هو التصدیق بالقلب والاقرار باللسان والعمل بالارکان (ایمان دل سے تصدیق، زبان سے اقرار اور اعضاء سے عمل کرنے کا نام ہے۔) ۳۵؎ اس لیے اہل تسنن کے برعکس عمل بالارکان کے

قائل نہیں ہوتے، اہل تشیع ایمان کے لیے اقرار باللسان اور تصدیق بالقلب کے علاوہ عمل بالارکان کو لازمی شرط مانتے ہیں۔ ایمان کے معاملہ میں عمل بالارکان کا مسئلہ نزاعی ہوگیا ہے۔ اہل تشیع ہر کلمہ گو کو مسلمان مانتے ہیں لیکن کسی کو مومن قرار دینے کے لئے تینوں شرائط اقرار باللسان، تصدیق بالقلب اور عمل بالارکان کو لازمی مانتے ہیں جبکہ اہل تسنن کے نزدیک ہر کلمہ گو مسلمان ہے اور ہر مسلمان مومن، خواہ اس کے اعمال اسلام کی تکذیب وتضحیک کرتے ہوں۔ اس نظریہ سے فائدہ اٹھا کر ظالم وفاسق خلفائے بنی امیہ وبنی عباس اسلام کے نام پر داغ مانے جانے کے باوجود مومن میں شمار ہوئے اور امیر المومنین کہہ کر مخاطب کیے گئے۔ اہل تسنن کے نزدیک فسق وفجور گناہ ہے، کفر نہیں، کوئی مسلمان کسی گناہ کی بناپر، خواہ کتنا ہی بڑا گناہ ہو، کافر قرار نہیں پاتا، جب تک وہ اس کے حلال ہونے کا قائل نہ ہو۔ اس کا ایمان سلب نہیں ہوتا بلکہ وہ بدستور مومن رہتا ہے۔ یہ ممکن ہے کہ ایک شخص فاسق وفاجر ہو اور کافر نہ ہو۔ ۳۶

امام ابو حنیفہ کا ارشاد ہے: ''امت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے گناہگار سب مومن ہیں، کافر نہیں۔'' ۳۷ اہل تسنن کا واضح عقیدہ ہے کہ بندہ خارج از ایمان نہیں ہوتا مگر صرف اس چیز کے انکار سے جس کے اقرار نے اسے ایمان میں داخل کیا۔ ۳۸ اس سے مسئلہ پیدا ہوا کہ فاسق وفاجر دوزخی ہوگا یا نہیں اور اگر وہ دوزخی ہوگا تو کیا دائمی ہوگا یا وقتی۔ ہر مسلمان کو مومن ماننے کے نتیجہ میں ابھرے سوال کا سیدھا جواب نہیں دیا جاتا بلکہ اپنی قبا کو سمیٹ کر کہا جاتا ہے کہ مبادا خون ناحق کے قطرے ان کے کپڑوں کو داغ دار نہ کردیں اور درمیانی جواب دیتے ہیں: ''ہم یہ نہیں کہتے کہ مومن کے لئے گناہ نقصان دہ نہیں ہے اور ہم نہ یہ کہتے ہیں کہ مومن دوزخ میں نہیں جائے گا اور نہ یہی کہتے ہیں کہ وہ ہمیشہ ہمیشہ دوزخ میں رہے گا، اگر وہ فاسق وفاجر ہو۔'' ۳۹ یا پھر یہ کہتے ہیں: ''ہم اہل قبلہ میں سے کسی کے نہ جنتی ہونے کا فیصلہ کرتے ہیں نہ دوزخی ہونے کا اور نہ ہم ان پر کفر یا شرک یا منافقت کا حکم لگاتے ہیں، جب تک کہ ان سے ایسی کسی بات کا عملاً ظہور نہ ہو، اور ان کی نیتوں کا معاملہ ہم خدا پر چھوڑتے

ہیں۔'' ۵ یہی منزل ہے۔ وہ کہیں اور سنا کرے کوئی! ماننے والا کون ہوگا کہ علمائے اہل تسنن اہل قبلہ پر کفر یا شرک یا منافقت کا فتویٰ صادر نہیں کرتے۔ دیگر فرقوں کی کون کہے، اہل تسنن کے مختلف مسالک ایک دوسرے پر تکفیر کا فتویٰ جاری کرتے رہتے ہیں۔

اہل تسنن میں اہل تشیع کے برعکس خلافت کا تدریجی سلسلہ نہیں رہا کہ ایک امام کے بعد دوسرا امام مقرر ہوتا۔ چونکہ امامت خلافت کی ملزوم ہوگئی، خلیفہ وقت ہی امام وقت ہوتا۔ اس اصول میں خلافت راشدہ تک (۴۱ھ/۶۶۱ء) کوئی عملی دشواری نہ ہوئی، لیکن اس کے بعد خلافت ملکوکیت میں تبدیل ہوگئی اور خلفاء کے کردار و عمل شریعت اسلامی سے تجاوز کرنے لگے تو انہیں امامت کا سزاوار نہیں سمجھا گیا، بلکہ شریعت اسلامی کے اہل تسنن میں چار مختلف دبستان قائم ہوگئے، جن کو شریعت اسلامی کے چار مصلے بھی کہتے ہیں۔ ان میں امام ابوحنیفہ (۸۰-۱۸۰ھ/۶۹۹-۷۶۷ء) کے پیرو حنفی، امام مالک (۹۵-۱۷۵ھ/۷۱۳-۷۹۱ء) کے پیرو مالکی، امام شافعی (۱۵۰-۲۰۴ھ/۷۶۷-۸۱۹ء) کے پیرو شافعی، اور امام حنبل (۱۶۴-۲۴۱ھ/۷۸۰-۸۵۵ء) کے پیرو حنبلی کہے جاتے ہیں۔ ہندوستان میں اہل السنت والجماعت میں زیادہ تر حنفی العقیدہ مسلمان ہیں۔ ان میں سخت ترین انشعاب، ہوگیا ہے۔ ان کے مختلف و متنوع مسالک وجود میں آگئے ہیں مثلاً اہل حدیث، وہابی، مقلد، غیر مقلد وغیرہ۔ یہ مسالک ایک دوسرے کو تکفیر کے فتووں سے نوازا کرتے ہیں۔

حواشی:

۱۔ ابن الاثیر ابوالحسن الجزری: الکامل فی تاریخ ج ۲ ص ۲۸ (حیدر آباد)

۲۔ Syed AmeerAli : The Spirit of Islam p 314(Delhi 1997)

۳۔ ابن خلکان: وفیات الاعیان: ج ۲ ص ۱۶۳ (قاہرہ ۱۸۹۲ء)

۴۔ بدرالدین محمد بن محمود لکردری: مناقب الامام الاعظم ج ۱ ص ۶۶-۵۶ (حیدر آباد ۱۳۲۱ھ)

۵۔ ابوالکلام آزاد: تذکرہ (مرتبہ مالک رام) حواشی ص ۳۸۸ (دہلی ۱۹۹۸ء)

۶۔ ابو الاعلیٰ مودودی: خلافت وملوکیت ص ۲۱۳ (دہلی ۱۹۸۱ء)
۷۔ الکردری: مناقب الامام اعظم ج ۲ ص ۷۲
۸۔ ابو الاعلیٰ مودودی: خطابت ص ۱۵۵ (دہلی ۱۹۹۳ء)
۹۔ ابن عبد البر، الانتقاء ص ۱۶۳ (قاہرہ ۱۹۵۰ء)
۱۰۔ خلافت وملوکیت ص ۲۳
۱۱۔ خلافت وملوکیت ص ۳۳، ابوالحسن علی ندوی: تاریخ دعوت وعزیمت ج ۱ ص ۲۳۰
۱۲۔ Lenin: Selected Works vol 32 P 81(Moscow)
۱۳۔ اشرف علی تھانوی: بیان القرآن تفسیر آل عمران ۳/ ۱۵۹
۱۴۔ مناقب الامام اعظم ج ۲ ص ۶۱
۱۵۔ نہج البلاغہ (اردو ترجمہ مفتی جعفر حسین) خطبہ ۱۴۲ ص ۳۷۹ (لکھنؤ ۱۹۹۶ء)
۱۶۔ مناقب الامام الاعظم ج ۲ ص ۷۲
۱۷۔ ایضاً ایضاً
۱۸۔ ابن ابی العز الحنفی شرح الطحاویہ ص ۱۶۔ ۴۰۳ (مصر ۱۹۵۳ء)
۱۹۔ علی قاری: شرح الفقہ الاکبر ص ۹۱ (دہلی ۱۳۴۸ھ)
۲۰۔ ابو بکر الجصاص: احکام القرآن ج ۱ ص ۸۱۔ ۸۰
۲۱۔ الذہبی مناقب الامام الاعظم ابی حنیفہ وصاحبیہ ج ۲ ص ۱۰۰ (مصر ۱۳۶۶ھ)
۲۲۔ الاحکام القرآن ج ۱ ص ۸۱
۲۳۔ احکام القرآن ج ۱ ص ۸۱
۲۴۔ ایضاً ایضاً
۲۵۔ السرخسی، شرح اسیر الکبیر ج ۱ ص ۹۸ (مصر ۱۹۵۷ء)
۲۶۔ خلافت وملوکیت ص ۲۹۴

۲۷۔ ایضاً ایضاً

۲۸۔ ایضاً ایضاً ص ۲۷۹

۲۹۔ نہج البلاغہ (اردو ترجمہ مفتی جعفر حسین) خطبہ ۹۵ ص ۸۸۔۲۸۷

۳۰۔ ابن ابی العز الحنفی، شرح الطحاریہ ص ۳۹۷ (مصر، ۱۹۵۴)

۳۱۔ خلافت وملوکیت ص ۲۱۶

۳۲۔ ابن حجر، الاصابہ فی تمیز الصحابہ ج ۲ ص ۵۰۲

۳۳۔ علی قاری، شرح الفقہ الاکبر ص ۱۰۳ (دہلی ۱۲۹ء)

۳۴۔ حسین، الجوہرۃ المنیف فی شرح وصیۃ الامام ابی حنیفہ ص ۷۔۶، ۳ (حیدر آباد ۱۹۳ء)

۳۵۔ بحوالہ نہج البلاغہ ص ۲۲۴

۳۶۔ علی قاری، شرح الفقہ الاکبر ص ۸۹۔۸۶، المغنیساری، شرح الاکبر ص ۲۸۔۲۷

۳۷۔ ابو حنیفہ: عقود الجواہر المنیفہ فی ادلۃ ابی حنیفہ ص ۶ (مصر ۱۳۷۳ھ)

۳۸۔ ابن ابی عز الحنفی نشرح الطحاویہ ص ۲۶۵ (مصر ۱۳۷۳ھ)

۳۹۔ مناقب الامام الاعظم ابی حنیفہ ج ا ص ۲۵۔۱۲۴

۴۰۔ شرح الطحادیہ ص ۱۳۔۲۱۲

☆☆☆☆☆☆☆

حدیث شناسی:

استاد محمد رضا حکیمی

معرفت کی صحیح منطق

قرآن کی نظر میں:

۱۔ اور اللہ سے ڈرو خدا تم کو (معاملات کی صفائی) سکھاتا ہے اور وہ ہر چیز کو خوب جانتا ہے۔ (سورہ بقرہ آیت ۲۸۲)

۲۔ تب فرشتوں نے (عاجزی سے) عرض کی تو (ہر عیب سے) پاک ہے ہم تو جو کچھ تو نے بتایا ہے اس کے علاوہ کچھ نہیں جانتے تو بڑا جاننے والا مصلحتوں کا پہچاننے والا ہے۔ (سورہ بقرہ آیت ۳۲)

۳۔ اور جن لوگوں نے ہماری راہ میں جہاد کیا انھیں ہم ضرور اپنی راہ کی ہدایت کریں گے۔ (سورہ عنکبوت ۶۹)

حدیث کی نظر میں:

۱۔ حضرت رسول کریمؐ نے ابن مسعود کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا اے ابن مسعود جو شخص بھی تلاش علم و دانش میں نکلتا ہے اور اس کا ہدف دنیا ہوتا ہے نیز وہ دنیا و دنیاوی آرائشوں کو علم پر ترجیح دیتا ہے تو ایسا شخص غضب خدا کا مستحق قرار دیا جاتا ہے۔ وہ یہودیوں عیسائیوں کے ساتھ جہنم کے آخری طبقہ میں ہوگا۔ یعنی وہ لوگ جنہوں نے کتاب خدا کو پس پشت ڈال دیا خداوند عالم کا ارشاد ہے پس جب ان کے پاس وہ چیز جسے پہچانتے تھے آگئی تو لگے انکار کرنے پس کافروں پر خدا کی لعنت ہے" (سورہ بقرہ آیت ۸۹)۔ مکارم الاخلاق ۵۲۸۔

۲۔ حضرت علیؑ نے فرمایا: خدا نہ کرے کہ تم علم کو چار چیزوں کے لئے حاصل کرو، تم علم کی وجہ سے عالموں کے درمیان خود کو بلند قامت سمجھو یا اس کے ذریعہ سے بے وقوفوں سے بحث ومباحثہ، جنگ وجدال کرو، یا پھر کسی بزم میں خود نمائی کرو یا لوگوں کو اپنی خوشی اور اپنی عظمت کے لئے اپنی طرف متوجہ کرو، ارشاد مفید ص ۱۱۱

۳۔ امام صادقؑ کا قول ہے کہ جو شخص بھی خدا کے لئے علم سیکھتا ہے، خدا کی خوشنودی کے لئے اس پر عمل کرتا ہے اور اسی کی رضا کے لئے دوسروں کو علم سیکھاتا ہے وہ ملکوت آسمان پہ بزرگ قرار دیا جاتا ہے اس مقام کے ساکنین کہتے ہیں کہ اس نے خدا کے لئے تحصیل علم کیا اسی کی خوشنودی کے لئے عمل کیا اور اسی کے لئے دوسروں کو اس کی تعلیم دی (''امالی'' طوسی ۴۶/۱)

۴۔ حضرت علی علیہ السلام کا ارشاد ہے: (خداوند عالم اس شخص کو بخش دیتا ہے جو کہ) معلومات کیلئے صحیح راہ جاننے کیلئے (زندگی) تحصیل علم میں وقت صرف کرتا ہے۔ (کافی ۱۷۲/۸)

معرفت اور اس کی بہترین راہیں:

قرآن کی نظر میں:

۱۔ اور تو دیکھتا ہے کہ جب یہ لوگ اس (قرآن) کو سنتے ہیں جو ہمارے رسول پر نازل کیا گیا ہے تو ان کی آنکھوں سے بیساختہ (چھلک کر) آنسو جاری ہوجاتا ہے کیونکہ انھوں نے (امر) حق کو پہچان لیا ہے (اور) عرض کرتے ہیں کہ اے میرے پالنے والے ہم تو ایمان لاچکے تو (رسول کی) تصدیق کرنے والوں کے ساتھ ہمیں بھی لکھ رکھ۔ (سورہ المائدہ آیت ۸۳)

۲۔ اس میں شک نہیں کہ جو شخص ((آگاہ) دل رکھتا ہے یا کان لگا کر حضور قلب سے سنتا ہے اس کے لئے اس میں (کافی) نصیحت ہے۔ (سورہ العلق آیت ۳۷)

۳۔ تو کیا وہ شخص جس کے سینہ کو خدا نے (قبول) اسلام کے لئے کشادہ کردیا ہے وہ اپنے پروردگار (کی ہدایت) کی روشنی پر (چلتا) ہے گمراہوں کے برابر ہوسکتا ہے۔ افسوس تو ان لوگوں پر ہے جن کے دل خدا کی یاد سے (غافل ہوکر) سخت ہوگئے ہیں یہ لوگ صریحی گمراہی میں (پڑے) ہیں۔(سورہ الزمر آیت ۲۲)

۴۔ کیا یہ لوگ روئے زمین پر چلے پھرے نہیں تاکہ ان کے ایسے دل ہوتے جیسے حق باتوں کو سمجھتے یا ان کے ایسے کان ہوتے جن کے ذریعے سے (سچی باتوں کو) سنتے کیونکہ آنکھیں اندھی نہیں ہوا کرتیں بلکہ دل جو سینے میں ہیں وہی اندھے ہوجایا کرتے ہیں۔(سورہ الحج آیت ۴۶)

۵۔ اور اس سے بڑھ کر اورکون ظالم ہوگا جس کو خدا کی آیتیں یاد دلائی جائیں اور وہ ان سے روگردانی کرے اور اپنے پہلے کرتوتوں کو جو اس کے ہاتھوں نے کئے ہیں بھول بیٹھے۔گویا)ہم نے خود ان کے دلوں پر پردے ڈال دئے ہیں کہ وہ (حق بات کو) نہ سمجھ سکیں۔ اور (گویا) ان کے کانوں میں گرانی پیدا کردی ہے کہ(سن نہ سکیں) اور اگرتم ان کو راہ راست کی طرف بلاؤ بھی تو یہ ہرگز کبھی روبراہ ہونے والے نہیں ہیں۔ (سورہ الکہف آیت ۵۷)

۶۔ جولوگ خدا اور روز آخرت پر ایمان رکھتے ہیں تم ان کو خدا اور اس کے رسول کے دشمنوں سے دوستی کرتے ہوئے نہ دیکھو گے اگرچہ وہ ان کے باپ یا بیٹے یا بھائی یا خاندان ہی کے لوگ (کیوں نہ ہوں) یہی وہ لوگ ہیں جن کے دلوں میں خدا نے ایمان کو ثابت کردیا ہے اور خاص اپنے نور سے ان کی تائید کی ہے اور ان کو (بہشت میں) ان (ہرے بھرے) باغوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں جاری ہیں (اور وہ) ہمیشہ اس میں رہیں گے، خدا ان سے راضی اور وہ خدا سے خوش یہی خدا کا گروہ ہے سن رکھو کہ خدا کے گروہ کے لوگ دلی مراد پائیں گے۔(سورہ المجادلہ آیت ۲۲)

۷۔ عرب کے دیہاتی کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے (اے رسول) تم کہدو کہ تم ایمان نہیں لائے بلکہ (یوں) کہو کہ اسلام لائے حالانکہ ایمان کا ابھی تک تمہارے دلوں میں گزر ہوا ہی نہیں اور اگر تم خدا کی اور اس کے رسول کی فرمانبرداری کروگے تو خدا تمہارے اعمال میں سے کچھ کم نہیں کرے گا بے شک خدا بڑا بخشنے والا مہربان ہے۔(سورہ الحجرات آیت ۱۴)

حدیث کی نظر میں:

۱۔ حضرت پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا علم دو طرح کا ہوتا ہے ایک وہ علم جو زبان پر ہوتا ہے ایسا علم اولاد آدم کے لئے حجت ہے دوسرا وہ علم جو قلب کی گہرائیوں میں اتر جاتا ہے یہ علم لوگوں کے لئے سود مند ہے۔(بحار ۲/ ۱۳۳ از کتاب ''عوالی اللئالی'')

۲۔ حضرت رسول کریمؐ نے فرمایا اپنے دلوں کو نرمی و مہربانی کی عادت دو بہت زیادہ غور و فکر کرو۔(بحار ۷۳/ ۸۱ از کتاب ''کنزل الفوائد)

۳۔ حضرت علیؑ نے فرمایا جو شخص عظیم نفس کا حامل ہوتا ہے اس کے احساسات بھی عظیم ہوتے ہیں اور جس کے احساسات بلند و بالا ہوتے ہیں اس کے علم و معرفت میں بھی اضافہ ہوتا ہے۔(غرر الحکم ۲۷۳)

۴۔ حضرت امام صادقؑ کا قول ہے عقل کی قیام گاہ دماغ ہے اور نرم و لطیف گفتگو کا مرکز دل ہے۔تحف العقول/ ۲۷۳)

۵۔ حضرت باقر العلومؑ نے فرمایا دل کو ہمیشہ غمخواری اور درد آشنائی سے روشن رکھو (تحف العقول ۲۰۷)

۶۔ حضرت امام باقرؑ نے فرمایا ایمان دل میں قیام پذیر ہے لیکن یقین کا کبھی کبھی ہی دل کی طرف سے گزر ہوتا ہے لیکن جب کبھی بھی دل کی طرف سے یقین کا گذر ہوتا ہے تو ایسا لگتا ہے کوئی فولاد کا ٹکڑا ہے اور جب یہ دل سے باہر آتا ہے تو ایسا لگتا ہے کہ یہ کوئی پرانے کپڑے کا ٹکڑا ہے۔(بحار ۷۸/ ۱۸۶-۱۸۵)

۷۔ امام صادقؑ نے فرمایا کہ دل کو اس کی جگہ سے ہٹانے سے زیادہ آسان ہے پہاڑ کو اپنی جگہ سے ہٹا کر دوسری جگہ کر دینا۔(تحف العقول؍ ۲۶۳)

۸۔ امام صادقؑ نے (کسی صحابی کو مخاطب کرتے ہوئے) فرمایا اے فلاں! یاد رکھو جسم میں قلب کی وہی حیثیت ہے جو لوگوں میں امام کی ہوتی ہے جس کی اطاعت فرمانبرداری لوگوں پر واجب ہے کیا تم نہیں دیکھتے کہ تمام اعضاء بدن قلب کے پیروکار اور ترجمان ہیں اور اس کے مطابق اپنے وظائف کی انجام دہی کرتے ہیں۔(علل الشرائع ۱؍ ۱۰۳)

۹۔ حضرت امام کاظمؑ نے (ہشام کو مخاطب کرتے ہوئے) فرمایا اے ہشام خداوند عالم اپنی کتاب میں ارشاد فرماتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ جو شخص دل رکھتا ہے اس کے لئے اس میں نصیحت ہے" سورہ ق آیت ۳۷ (یعنی عقل اصول کافی ۱؍ ۱۶)

۱۰۔ حضرت امام باقرؑ نے فرمایا قلب کی غربت سے بڑھ کر کوئی غریبی نہیں (تحف العقول ۲۰۸)

۱۱۔ حضرت امام سجادؑ نے دعاء کرتے ہوئے فرمایا اے پالنے والے میرے دل کو برے کاموں سے ایسے گناہوں سے جو رسوائی کا سبب بنیں اور لوگوں کی بیزاری سے محفوظ رکھ۔ (صحیفہ سجادیہ ۴۹ ۳ دعا ۴۸)

۱۲۔ حضرت زین العابدینؑ نے فرمایا اے پالنے والے محمد وآل محمد پر درود نازل فرما اور میرے دل کو اپنی محبت والفت کے لئے خالی کردے...اور اسے اپنی محبت کے طفیل میں کامیاب کردے۔(صحیفہ سجادیہ ۱۴۶ دعا ۲۱)

۱۳۔ حضرت امام سجادؑ نے فرمایا اے میرے خدا مجھے اپنا عاشق قرار دے۔(صحیفہ سجادیہ ۱۴۹ دعا ۲۲)

۱۴۔ حضرت امام سجادؑ نے فرمایا اے میرے معبود محمد وآل محمد پر درود نازل فرما... اپنے خوف کو میرے دل پر آشکار کردے۔ اور میرے جسم کو ان کاموں میں مشغول کردے جسے تو

پسند کرتا ہے اور میرے نفس کو اپنی فرمانبرداری میں اس طرح سرگرم عمل کردے کہ جو کچھ بھی میرے اوپر آئے ہیں اسے دور کردوں اور میں اس طرح ہوجاؤں کہ کسی بھی صورت میں تیری ناراضگی کو پسند نہ کروں اور جس چیز سے تو راضی ہے میں اس سے کبھی بھی کبیدہ خاطر نہ ہوں اے پالنے والے محمد وآل محمد درود نازل فرما اور میرے دل کو اپنی مہر والفت کے لئے خالی کردے مجھے اپنے ذکر میں مشغول رکھ۔ ایسی حیات عطا فرما جو تیرے خوف اور تجھ سے امید و بیم پر منحصر ہو اپنی محبت کی کشش سے مجھے کامیاب فرما، اپنی فرمانبرداری کی طرف مجھے مائل کردے اور جس راہ کو بھی تو پسند کرتا ہے اس پر مجھے گامزن رکھ اور میری حیات کو ہر اس چیز کے حصول کا ضامن بنا دے جسے تو پسند کرتا ہے۔(صحیفہ سجادیہ ۱۴۶-۱۴۵ دعا ۲۱)

۱۵۔ حضرت سید الساجدینؑ نے ایک اور مقام پر فرمایا پالنے والے محمد وآل محمد پر درود نازل فرما اور مجھے ایسی روزی کی طرف راغب کردے جس کے ذریعہ میں تیرے حکم کے مطابق آخرت کے امور انجام دے سکوں تاکہ میں سچے دل سے اس راہ کو حاصل کرسکوں اور اپنی دنیا کو زہد و ورع کے ساتھ گذار سکوں اور نیک امور کی انجام دہی کے لئے ذوق وشوق کے ساتھ اٹھ کھڑا ہوجاؤں اور تیرے خوف کی وجہ سے برے کاموں کے انجام دینے سے محفوظ رہوں۔ ایسا نور عطا فرما جس سے میں لوگوں کے درمیان اپنی راہ بنا سکوں اور اپنی راہ کو اندھیروں میں پاسکوں اور اس نور کے پرتو سے میں شک وشبہ سے دور رہ سکوں۔(صحیفہ سجادیہ ۱۵۱ دعاء ۲۲)

۱۶۔ حضرت امام باقرؑ نے فرمایا غافل رہنے سے بچو اس لئے کہ غافل رہنے سے دل سخت ہوجاتا ہے۔(تحف العقول۔ ۲۰۷)

۱۷۔ حضرت امام صادقؑ نے فرمایا زیادہ کھانے پینے سے زیادہ نیند آتی ہے اور زیادہ بیا زیادہ سیر و رغبت کا نتیجہ ہے یہ دونوں عمل نفس انسانی کو خدا کی فرمانبرداری سے روک دیتے ہیں دل کو سخت کرتے ہیں اور فکر و فہم خضوع وخشوع میں حائل ہوجاتے ہیں۔(”بحار ۷۶/۱۸۹ از کتاب مصباح الشریعہ“)

۱۸۔ حضرت امیر المومنینؑ کا ارشاد ہے کہ وہ دل نہ ہونا کہ شک راہ لے.... اپنے نفسوں کو آزادانہ چھوڑو تا کہ وہ تمہیں دھوکہ دے سکے۔ حق کے سلسلہ میں شکاری کے سامان مت ہو جاؤ تا کہ وہ تمہیں دھوکہ دے سکے.... خدا سے یقین کی درخواست کرو اور حالت خوشی و عافیت میں بھی اس کے درگاہ میں سربسجود رہو بہترین چیز جو قلب میں داخل ہوتی ہے وہ یقین ہے (بحار۔ ۲/ ۵۴ از کتاب مجالس مفید)

۱۹۔ پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا بدترین اندھاپن دل کا اندھاپن ہے۔ (اختصاص ۳۳۹۔)

۲۰۔ امام محمد باقرؑ نے فرمایا دلوں کی تین قسمیں ہیں ایک ایسا دل جسے کسی خیر یا نیکی کی خبر بھی نہیں وہ کافر کا دل ہے اور وہ دل جس میں کہ سیاہ نقطہ ہے اس وجہ سے خیر و شر آپس میں ایک دوسرے سے برسر پیکار رہتے ہیں ان میں سے جو فتحیاب ہوتا ہے وہ دوسرے کو مسخر کرلیتا ہے اور وہ کشادہ دل جس میں کہ چراغ روشن ہے جس کی روشنی روز جزاء تک مدھم نہیں ہوگی وہ مومن کا دل ہے۔ (بحار ۷۰/ ۵۰ معانی الاخبار ۲/ ۳۷۶)

معرفت کے ارتقائی مراحل

قرآن کی نظر میں:

۱۔ اور اسی طرح ہم ابراہیم کو سارے آسمان اور زمین کی سلطنت کا (انتظام) دکھاتے رہے تا کہ وہ (ہماری وحدانیت کا) یقین کرنے والوں میں سے ہو جائیں۔ سورہ الانعام آیت ۷۵

۲ اور ہم نے تو موسیٰ کو بھی (آسمانی کتاب) توریت عطا کی تھی تو تم بھی اس کتاب (قرآن) کے (منجانب اللہ) ملنے سے شک میں نہ (پڑے) رہو اور ہم نے تو اس (توریت) کو بنی اسرائیل کے لئے رہنما قرار دیا تھا اور ان ہی (بنی اسرائیل) میں سے ہم نے کچھ لوگوں کو چونکہ انھوں نے (مصیبتوں پر) صبر کیا تھا پیشوا بنایا جو ہمارے حکم سے (لوگوں کی) ہدایت کرتے تھے اور (اس کے علاوہ) ہماری آیتوں کا دل سے یقین رکھتے تھے۔ (سورہ السجدہ

آیت ۲۳۔۲۴)

۳۔ اور یقین کرنے والوں کے لئے زمین میں (قدرت خدا کی) بہت سی نشانیاں ہیں اور خود تم میں بھی ہیں تو کیا تم دیکھتے نہیں۔(سورہ الذاریات آیت ۲۰۔۲۱)

حدیث کی نظر میں:

۱۔ حضرت رسول کریمؐ نے فرمایا کہ بہترین چیز جو قلب میں ڈالی گئی ہے وہ یقین ہے (بحار ۷۰/ ۱۷۳)

۲۔ حضرت امیر المومنینؑ نے فرمایا اور خداوند عالم کے لئے یہ سزاوار ہے کہ اس کی نعمتوں کو ہمیشہ اور ہر زمانے میں پیغمبروں کے فاصلوں کے باوجود باقی رکھا (بندگی کا تقاضا یہ ہے کہ) ان کے باطن کے بارے میں مناجات کریں۔ اور آپس میں ایک دوسرے سے عقلمندی کی باتیں کریں اس طرح لوگ اپنے آنکھ، کان اور دلوں کو روشن کریں اور خدا کے مخصوص دین سے وابستہ رہیں۔(نہج البلاغہ۔۲۰۳ ۷)

۳۔ حضرت امام باقرؑ نے فرمایا یقین بہت بڑی بے نیازی ہے۔(وسائل ۱/ ۶۴)

۴۔ حضرت باقر العلوم کا ارشاد ہے نور یقین سے بڑھ کر کوئی یقین نہیں۔(تحف العقول ۲۰۸)

۵۔ امام صادقؑ نے فرمایا کہ میں نے نور قلب طلب کیا تو اسے میں نے فکر کرنے اور گریہ کرنے میں پایا۔(مستدرک ۲/ ۳۵۷)

۶۔ امام محمد باقر علیہ السلام نے خداوند عالم کے اس قول " بے شک اس میں صاحبان فراست کے لئے نشانیاں ہیں سورہ حجر آیت ۷۵ کے سلسلہ میں فرمایا کہ یہ ہم آئمہ کے لئے ہے رسول گرامی قدر کا ارشاد ہے مومن کی فہم فراست سے ڈرتے رہو اس لئے کہ وہ نور خدا سے دیکھتا ہے اور یہ خدا کا وہی قول ہے کہ " بے شک اس میں صاحبان فراست کے لئے نشانیاں ہیں"۔(بصائر الدرجات ۳۷۵)

۷۔ حضرت امام رضا علیہ السلام نے اپنے آباء کرام کے حوالے سے فرمایا کہ رسول خدا کا ارشاد ہے کہ مومن اللہ کے نور سے دیکھتا ہے۔(بحار ۶۷/ ۷۵)

۸۔ حضرت امیر المومنینؑ نے فرمایا کہ جب کوئی شخص خود کو خداوند عالم کے فرمان کے آگے سپر انداختہ کردیتا ہے تو وہ بڑے بڑے امور انجام دینے لگتا ہے جو کام بھی اس کے سامنے آتا ہے اسے بحسن وخوبی انجام دیتا ہے اور ہر فرع کو اصل سے منطبق کرتا ہے ۔ وہ شب تار میں روشن چراغ ہے۔ وہ مخفی چیزوں کو ظاہر کرنے ،شبہات کے لئے کنجی مشکلات کے حل کرنے کا ذریعہ اور بیابانوں میں رہنما ہے جب وہ گفتگو کرتا ہے تو حقیقت کی گرہیں کھول دیتا ہے۔(نہج البلاغہ۔۲۱۰)

۹۔ حضرت امام صادقؑ نے فرمایا، یاد رکھو قلیل عمل جس میں یقین کے ساتھ پائیداری پائی جائے وہ اس کثیر عمل سے بہتر ہے جو غیر یقینی صورت میں انجام دیا جائے۔(تحف العقول ۲۶۴)

ارتقائی معرفت کے مراحل

۱۔ پائیداری اور اقدام

قرآن کی نظر میں:

۱۔ اے رسول تم مومنین کو جہاد کے لئے آمادہ کرو اگر تم لوگوں میں سے ثابت قدم رہنے والے بیس بھی ہوں گے تو وہ دوسو (کافروں) پر غالب آجائیں گے اور اگر تم لوگوں میں سے (ایسے) سوہوں گے تو ہزار (کافروں) پر غالب آجائیں گے اس لئے کہ یہ لوگ ناسمجھ ہیں (حق کو نہیں پہچانتے) (سورہ انفال آیت ۶۵)

۲۔ اور جن لوگوں کو (کتب سماوی کا) علم عطا ہوا ہے وہ جان لیں کہ یہ (وحی) بے

شک تمہارے پروردگار کی طرف سے ٹھیک ٹھیک (نازل) ہوئی ہے پھر (یہ خیال کرکے) اس پر وہ لوگ ایمان لائیں پھر ان کے دل خدا کے سامنے عاجزی کریں اور اس میں تو شک ہی نہیں کہ جن لوگوں نے ایمان قبول کیا ان کو خدا سیدھی راہ تک پہونچا دیتا ہے۔(سورہ حج آیت ۵۴)

۳۔ (مومنوں) تمہاری ہیبت ان کے دلوں میں خدا سے بھی بڑھ کر ہے۔ یہ اس وجہ سے کہ یہ لوگ سمجھ نہیں رکھتے یہ سب کے سب بھی مل کر تم سے نہیں لڑ سکتے، مگر ہر طرف سے محفوظ بستیوں میں یا دیواروں کی آڑ میں ان کی آپس میں تو بڑی دھاک ہے کہ تم خیال کروگے کہ سب کے سب ایک جان ہیں مگر ان کے دل ایک دوسرے سے پھٹے ہوئے ہیں یہ اس وجہ سے کہ یہ لوگ بے عقل ہیں۔(سورہ حشر ۱۴۔۱۳)

حدیث کی نظر میں:

۱۔حضرت امیر المومنین علیہ السلام نے فرمایا جس کا قلب یقین تک نہیں پہنچ سکتا اس کا عمل اس کے فرمان کے مطابق نہیں۔(غرر الحکم ۲۹۴)

۲۔حضرت علیؑ کا ارشاد ہے جسے یقین حاصل ہوتا ہے اس کی کوششیں تیز ہوجاتی ہیں۔(غرر الحکم ۲۶۹)

۳۔حضرت علیؑ نے فرمایا اپنی جانب آنے والے رنج وغم کو مضبوط ارادوں اور نیک یقین کے ساتھ دور کردو۔(نہج البلاغہ ۹۳۵ عبدہ ۲/ ۵۷)

۴۔حضرت امام صادقؑ نے فرمایا کوئی چیز ایسی نہیں جس کی ایک حد نہ ہو آپ سے سوال کیا گیا کہ یقین کی حد کیا ہے آپ نے ارشاد فرمایا کوئی چیز امید وبیم پر باقی نہ رہے۔(تحف العقول ۲۶۶)

۵۔ حضرت علیؑ کا ارشاد ہے یقین کی حالت میں رہنا کہ قوی رہو۔(غرر الحکم ۲۴۵)

۶۔حضرت امام صادقؑ نے فرمایا پہاڑ کو ایک جگہ سے دوسری جگہ کرنا آسان ہے بہ نسبت اس کے کہ قلب کی جگہ تبدیل کی جائے۔(تحف العقول ۲۶۳)

۷۔ حضرت صادقؑ کا قول ہے کہ کسی کے ساتھ کام کے لئے اسی طرح اٹھ کھڑے ہو جیسے تم نے اسے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔(مشکوۃ الانوار ۴۶)

۸۔حضرت علیؑ نے فرمایا ہمت وکوشش رائے کے تناسب (اور معرفت) سے ہے۔ (غرر الحکم ۲۱۵)

۹۔حضرت رسول کریمؐ نے فرمایا جو شخص بلا و مصیبت کو پہچان لیتا ہے وہ اس پر صبر کرتا ہے اور جو اسے نہیں پہچانتا وہ اس کا انکار کرتا ہے۔(بحار ۷۱/ ۸۳)

۱۰۔حضرت علیؑ کا ارشاد ہے کہ اپنے حق کے سلسلہ میں کوئی شخص بھی صبر نہیں کرتا سوائے اسکے جو اس کے فضل سے واقف ہو۔(غرر الحکم ۳۴۹)

۱۱۔حضرت علیؑ نے فرمایا، حق کی تلخی پر صبر نہیں کرتا مگر وہ جو عاقبت کی شیرینی پہ یقین رکھتا ہے۔(غرر الحکم ۳۵۴)

۱۲۔امام صادق علیہ السلام نے فرمایا۔صبر یقین سے حاصل ہوتا ہے۔(مشکوۃ الانوار ۲۰۔)

ب۔ مشکلات پر غلبہ حاصل کر لینا۔

قرآن کی نظر میں:

۱۔ اور ہمیں (آخر) کیا ہے کہ ہم اس پر بھروسہ نہ کریں حالانکہ ہمیں (نجات کی) اسی نے راہیں دکھائیں اور جو جو اذیتیں ہمیں پہونچائیں (ان پر ہم نے صبر کیا) اور آئندہ بھی صبر کریں گے اور توکل کرنے والوں کو خدا ہی پر توکل کرنا چاہئے۔(سورہ ابراہیم آیت ۱۲)

۲۔ موسیٰؑ نے ان (خضر) سے کہا کیا میں اس غرض سے آپ کے ساتھ ساتھ رہوں کہ

جو رہنمائی کا علم آپ کو (خدا کی طرف سے) سکھایا گیا ہے اس میں سے کچھ بھی سکھا دیجئے خضر نے کہا آپ سے میرے ساتھ صبر نہ ہو سکے گا اور (سچ تو یہ ہے) جو چیز آپ کے علمی احاطہ سے باہر ہو اس پر آپ کیونکر صبر کر سکتے ہیں۔ (سورہ کہف آیت ۶۸-۶۶)

حدیث کی نظر میں:

۱۔ حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا علم ایک مضبوط قلعہ ہے۔ (غرر الحکم ۱۴)

۲۔ حضرت امیر المومنین کا ارشاد ہے مومنین کے گذشتہ احوال کے سلسلہ میں اچھی طرح غور و فکر کرونا کہ تم یہ دیکھ سکو کہ وہ لوگ فتنہ و بلا میں کس طرح مبتلا رہے ہیں اور اس طرف بھی توجہ کرو کہ اس حالت میں جب کہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ تھے اور ان لوگوں کی خواہشات و آرزوئیں ایک جیسی تھیں ان کے قلوب اعتدال پر تھے ان کے ہاتھوں سے ایک دوسرے کی مدد ہوا کرتی تھی، ان کی تلواریں لوگوں کی مدد کے لئے بلند ہوا کرتیں انھوں نے یا ایک بینی حاصل کی تھی انکا ایک ہدف تھا کیا وہ لوگ خدا کی زمین کے مالک نہ تھے اور اس پر (اس کی زمین پر) حکمرانی نہ کرتے تھے۔ (نہج البلاغہ ۸۰۲)

ج۔ عمل کا حد کمال کو پہنچنا۔

حدیث کی نظر میں:

۱۔ حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا علم کا کمال عمل ہے۔ (غرر الحکم ۲۴۹)

۲۔ حضرت علیؑ کا ارشاد ہے کوئی بھی علم بغیر علم کے قدر و قیمت نہیں رکھتا۔ (غرر الحکم ۲۲۲)

۳۔ حضرت علیؑ نے فرمایا علم کا بہترین نتیجہ بہترین کردار ہے۔ (غرر الحکم ۳۰۹)

۴۔ حضرت علیؑ کا قول ہے جب تک علم درست نہ ہوگا اس وقت تک عمل پاک و پاکیزہ نہیں ہو سکتا۔ (غرر الحکم ۲۵۵)

۵۔حضرت امام جعفر صادقؑ نے اس آیت: والذین یوتون ما آتوا وقلوبھم وجلۃ انھم الی ربھم راجعون۔" (اور جو لوگ (خدا کی راہ میں) جو کچھ بن پڑتا ہے دیتے ہیں اور پھر ان کے دل کو اس بات کا کھٹکا لگا ہوا ہے کہ انھیں اپنے پروردگار کے پاس لوٹ کر جانا ہے۔) سورہ مومنون ۶۰ کی تفسیر میں فرمایا اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو خود ایسے اعمال انجام دیتے ہیں جس کے بارے میں انھیں معلوم ہے کہ اس کا اجر دیا جائے گا۔(بحار ۷۰/ ۱۷۷ از کتاب المحاسن۔)

د: اجتماعی بیداری

حدیث کی نظر میں:

۱۔حضرت امام صادقؑ نے فرمایا جو شخص اپنے وقت کی نسبت سے ہوشیار ہے وہ مشکوک کاموں اور گمراہی کی باتوں میں گرفتار نہیں ہوتا۔(تحف العقول ۲۶۱)

۲۔حضرت علیؑ نے فرمایا جس کا تجربہ کم ہوتا ہے وہ دھوکہ کھاتا ہے۔(غرر الحکم ۲۶۸)

ھ: اپنی تعمیر کیلئے آمادہ ہونا۔ (تہذیب نفس کیلئے)

حدیث کی نظر میں:

۱۔ حضرت علیؑ کا ارشاد ہے ناداں لوگوں کے دلوں کو امید دلا کر آمادہ کرو، آرزؤں کا نتیجہ قید ہے اور فریب و دھوکہ قید و بند کی طرف لاتا ہے۔(اصول کافی ۱/ ۲۳)

۲ حضرت علیؑ نے فرمایا جس شخص کی عقل بڑھتی جاتی ہے وہ اپنی تہذیب نفس میں اضافہ کی کوشش کرتا ہے اور جس قدر وہ طاقت رکھتا ہے وہ تربیت نفس اور اس کے اصلاح کی کوشش کرتا ہے۔(غرر الحکم ۲۴۸)

۳۔ حضرت علیؑ نے فرمایا: جو شخص عقل کامل رکھتا ہے وہ ہوس و شہوت کو ناچیز اور ہیچ

سمجھتا ہے۔(غررالحکم ۴ ۲۷)

۴۔ حضرت امیر المومنینؑ نے فرمایا عقل کا کامل ہوجانا بری عادت کے ختم ہونے کا سبب ہے (بحار ۷۸ / ۶ از کتاب مطالب السؤول۔)

۵۔ حضرت علیؑ نے فرمایا: بردباری ڈھکنے والی چیز ہے اور عقل (آگاہی ومعرفت) شمشیر آبدار ہے لہذا اپنی اخلاق کمیوں کو بردباری سے ڈھک دو اور اپنی عقل کی مدد سے ہو ائے نفس سے لڑنے کے لئے آمادہ ہوجاؤ۔(نہج البلاغہ/ ۱۲۸۵: عبدہ ۲/ ۲۴۵)

۶۔ حضرت علیؑ کا ارشاد ہے نفس کا کمال عقل سے ہے۔(غررالحکم ۱۴۸)

و: ادای مقصود:

حدیث کی نظر میں:

۱۔ حضرت صادق آل محمدؐ سے سوال کیا گیا کہ بلاغت کیا ہے! آپ نے فرمایا انسان جو کچھ جانتا ہے اس کے کم سے کم الفاظ میں بیان کردے اور کسی بھی شخص کو اس لئے بلیغ کہتے ہیں کہ وہ بہت تھوڑی سی کوشش سے اپنی مراد حاصل کرلیتا ہے اور اپنا مطلب بیان کردیتا ہے۔(تحف العقول ۲۶۴)

معرفت اور لوگوں سے ارتباط

قرآن کی نظر میں:

۱۔ تم خیال کروگے کہ سب کے سب ایک (جان) ہیں مگر ان کے دل ایک دوسرے سے پھٹے ہوئے ہیں یہ اس وجہ سے کہ یہ لوگ بے عقل ہیں۔(اور علم ومعرفت سے بے بہرہ ہیں)(سورہ حشر ۱۴)

حدیث کی نظر میں:

۱۔ حضرت علیؑ نے فرمایا غوروفکر اور تامل کے بعد جوارادہ کیا جاتا ہے وہ استوار اور ایک جہتی پر مشتمل ہوتا ہے۔(نہج البلاغہ ۸۰۲)

۲۔ حضرت امام رضا علیہ السلام نے فرمایا علم ودانائی اپنے جاننے والوں کو والدین سے بہتر جمع کر لیتے ہیں۔(عیون اخبار الرضا۲/ ۱۳۱)

تجربہ کی معرفت

قرآن کی نظر میں:

۱۔ کیا یہ لوگ روئے زمین پر چلے پھرے نہیں تا کہ ان کے ایسے دل ہوتے جیسے حق باتوں کو سمجھتے یا ان کے ایسے کان ہوتے جن کے ذریعہ سے (سچی باتوں کو سنتے....
(سورہ حج آیت ۴۶)

حدیث کی نظر میں:

۱۔ حضرت پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا جو شخص اپنے علم پر عمل کرتا ہے تو خدا وند عالم اسے اس علم سے بھی فائدہ پہونچاتا ہے جسے وہ نہیں جانتا۔(بحار ۴۰/ ۱۲۹)

۲۔ حضرت علیؑ نے فرمایا عقل ایک ایسی طبعی قدرت ہے جس سے علم وتجربہ میں اضافہ ہوتا ہے۔(غرر الحکم ۴۰)

۳۔ حضرت امیر المومنینؑ کا ارشاد ہے عقل کی دو قسمیں ہیں ایک طبعی عقل ہے ایک تجرباتی عقل ہے یہ دونوں ہی منفعت کا سرچشمہ ہیں اور تنہا وہ شخص قابل اطمینان ہے جس کے پاس عقل بھی ہو اور دین بھی اور جو شخص اور جوانمردی سے بے بہرہ ہے اسکا زیادہ تر کام گناہ ہے۔(بحار۔۷۸/ ۶ از کتاب مطالب السؤول۔)

۴۔ حضرت علیؑ کا یہ بھی ارشاد ہے کہ اگر آزمائشیں اور تجربے نہ ہوتے تو راہیں دشوار ہوجاتیں۔(ارشاد" ۱۴۳)

۵۔ حضرت علیؑ نے فرمایا تجربہ سے علم ودانش کی راہیں کھلتی ہیں(کافی ۸/ ۲۲)

۶۔ حضرت امام حسینؑ نے فرمایا پے درپے تجربہ عقل میں اضافہ کا سبب ہے (بحار ۷۸/ ۱۲۸)

۷۔ حضرت علیؑ نے فرمایا عقل تجربوں کی حفاظت کرتی ہے۔(نہج البلاغہ ۹۳۱،عبدہ ۲/ ۵۴)

۸۔ حضرت امیر المومنینؑ کا ارشاد ہے عقلمند وہی ہے جو تجربہ سے نصیحت قبول کرے۔(تحف العقول ۶۲)

۹۔ حضرت علیؑ نے فرمایا۔ تجربہ کبھی تمام نہیں ہوتا۔(غرر الحکم ۱۶)

۱۰۔ حضرت علیؑ نے فرمایا۔ ہر طرح کی مدد تجربہ کی محتاج ہے(بحار ۷۸/ ۷ از کتاب مطالب السؤول)

۱۱۔ حضرت علیؑ نے فرمایا۔ جو شخص اپنے کاموں میں تجربہ نہیں کرتا وہ دھوکہ کھاتا ہے۔(ارشاد ۱۴۲)

۱۲۔ حضرت امیر المومنین علیہ السلام نے فرمایا تم نے خود تجربہ کیا ہے اور آزمائش کی ہے اورتم نے گذشتگان کی سرگذشت سے نصیحتیں حاصل کی ہیں کہ جو شخص مصیبت وپریشانی سے نصیحت حاصل نہیں کرتا اس کو کوئی نصیحت فائدہ نہیں پہونچا سکتی ۔(نہج البلاغہ ۵۷۴)

۱۳۔ حضرت علیؑ نے فرمایا تجربہ کو یاد رکھنا (اور اس کا اپنے مقام پر استعمال کرنا) کامیابی کی علامت ہے۔(نہج البلاغہ ۱۱۸۲)

۱۴۔ حضرت امام صادق علیہ السلام نے فرمایا عقلمند انسان ایک سوراخ سے دوبار نہیں ڈسا جاتا۔(اختصاص۔۲۳۸)

۱۵۔ حضرت علیؑ نے فرمایا (اے میرے نورنظر) قبل اس کے کہ تمہارا دل سخت اور عقل مشغول ہوجائے وہ تجربے جس کو حاصل کرنے کے لئے دوسروں نے زحمتیں برداشت کی ہیں اس سے فائدہ حاصل کرو تا کہ تم کو خود اس کی تکالیف وصعوبتوں سے آزاد رہ سکو اسی لئے میں نے ازراہ تجربہ جو کچھ حاصل کیا وہ تمہارے اختیار میں دیتا ہوں۔(نہج البلاغہ ۹۱۲، عبدہ ۲/ ۴۲)

۱۶۔ حضرت علیؑ کا ارشاد ہے اے لوگوں تمہارے ذریعہ دشمن کے سروں پر جو چیز آئی تم نے اسے ملاحظہ کیا اب جب ان میں سے کوئی ایک شخص باقی نہیں رہ گیا اب جب کوئی مرحلہ درپیش آئے اس کے انجام اور اسکے اختتام کو اس کے آغاز سے پہچان لو۔(بحار ۸/ ۵۲۰)

۱۷۔ حضرت علیؑ نے فرمایا جب کوئی کام درہم وبرہم اور مشتبہ ہوجائے تو ہر کام کے اختتام پر اس کی ابتداء سے غور وفکر کرو۔(نہج البلاغہ/ ۱۱۱۸)

۱۸۔ حضرت علیؑ کا ارشاد ہے جو کچھ نہیں ہوا ہے اسے ان چیزوں پر جو ہوچکی ہیں قیاس کرو اس لئے کہ تمام امور ایک دوسرے جیسے ہیں۔(نہج البلاغہ/ ۱۱۸۳)

۱۹۔ حضرت علیؑ نے فرمایا جو شخص نصیحتوں اور عبرتوں کو (زمانے کے حالات اور ان کی نصیحتوں) ان کے انجام کے ظاہر ہونے کے بالمقابل اپنی آنکھوں کو کھولے رکھے اس کو قدم اٹھانے اور شبہ میں مبتلا ہونے سے محفوظ رکھتی ہے۔(نہج البلاغہ/ ۱۱۸۳)

۲۰۔ حضرت امیر المومنین علیہ السلام کا ارشاد ہے حالات کی ابتری سے لوگوں کے جوہر کھلتے ہیں۔(نہج البلاغہ/ ۱۱۸۳)

☆☆☆☆☆☆

تاریخ اسلام:

آیت اللہ جعفر سبحانی

ہجرت کے پانچویں سال کے واقعات:

غلط رسومات کی سرکوبی

شہر مکہ سے پیغمبر عظیم الشان کی ہجرت کے پانچویں سال رونما ہونے والے اہم اور دلچسپ واقعات میں جنگ احزاب، داستان بنی قریظہ اور زینب بنت جحش کے ساتھ پیغمبر اسلامؐ کی شادی خانہ آبادی کو نمایاں حیثیت حاصل ہے۔ اسلامی مصنفین کا خیال ہے کہ زینب کے ساتھ پیغمبرؐ کی شادی ان حوادث کا سرآغاز ہے۔

قرآن مجید نے سورۂ احزاب کی آیات نمبر ۴، ۶ اور ۳۶ لغایۃ ۴۰ میں مذکورہ داستان کو ایسے واضح انداز میں بیان کردیا ہے کہ مستشرقین ودیگر ماہرین کے لئے دروغ بیانی یا خیال پردازی کی گنجائش ہی نہیں رہ جاتی۔ ہم اس داستان کے تجزیہ کے لئے پہلے مذہب اسلام کی صحیح ترین اور اہم ترین تاریخی سند یعنی قرآن مجید کا سہارا لیتے ہیں۔ اس کے بعد مستشرقین نے اس سلسلے میں جو خیالات ظاہر کئے ہیں ان کا بھی جائزہ لیا جائے گا۔

زید بن حارثہ کون ہیں؟!

زید وہ نوجوان ہے جس کو عربستان کے جنگلی لٹیرے ایک قافلے سے اٹھا لے گئے تھے اور کچھ عرصے بعد "عکاظ" نامی بازار میں انھیں غلام کی حیثیت سے فروخت کردیا تھا۔ حکیم بن حزام نے انہیں اپنی پھوپھی حضرت خدیجہ کے لئے خریدا تھا اور شادی کے بعد خدیجہ نے اس نوجوان کو حضرت محمدؐ کے حوالے کردیا تھا۔

پیغمبرؐ کی شفقت ومحبت اور خوش اخلاقی وپاکیزہ خیالی کی وجہ سے زید انکے گرویدہ

ہوگئے چنانچہ جب زید کے والد اپنے بیٹے کی تلاش میں مکہ آئے اور پیغمبر اکرمؐ سے یہ مطالبہ کیا کہ وہ زید کو آزاد کردیں تا کہ وہ انہیں ان کی والدہ اور گھر والوں سے ملانے کے لئے اپنے ساتھ لے جائیں۔ لیکن زید اپنے والد کے ساتھ جانے کے لئے قطعی آمادہ نہ ہوئے بلکہ وطن وخاندان والوں کی محبت پر پیغمبرؐ کی خدمت کو ترجیح دی۔ جبکہ رسول خداؐ نے انہیں مکہ میں ٹھہرنے یا وطن واپس جانے کے لئے پوری طرح آزاد اور صاحب اختیار بنادیا تھا۔

درحقیقت یہ روحانی اور قلبی لگاؤ دوطرفہ تھا۔ اگر زید پیغمبر اکرمؐ کی خوش اخلاقی اور شفقت ومحبت کے دیوانے تھے تو دوسری طرف پیغمبرؐ بھی ان سے بڑی محبت کرتے تھے اور انہیں اپنے فرزند کی طرح عزیز رکھتے تھے چنانچہ لوگ انھیں ''زید بن حارثہ'' کے بجائے ''زید بن محمد'' کے نام سے پکارتے تھے۔ پیغمبرؐ نے اس بات کو سرکاری حیثیت عطا کرنے کے لئے ایک دن زید کا ہاتھ پکڑ کر قبیلہ قریش کے لوگوں کو مخاطب کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

''یہ میرا فرزند ہے اور ہم لوگوں کو ایک دوسرے سے میراث کا حق حاصل ہے۔''

آپسی محبت اور قلبی لگاؤ کا یہ سلسلہ اسی طرح چلتا رہا یہاں تک کہ جنگ موتہ میں زید شہادت سے ہم آغوش ہوگئے اور ان کی وفات پر پیغمبرؐ ویسے ہی غمزدہ وسوگوار تھے جیسے اپنے بیٹے کی وفات پر کوئی باپ رنجیدہ وغمگین ہوتا ہے۔[2]

پیغمبرؐ کی پھوپھی زاد بہن کے ساتھ زید کی شادی:

پیغمبر اکرمؐ کا اہم اور مقدس مقصد یہ تھا کہ وہ لوگوں کے درمیان موجود فاصلوں کو کم کرتے ہوئے ان میں قربت ونزدیکی پیدا کردیں اور لوگوں کو انسانیت اور تقویٰ وپرہیزگاری کے سایہ میں ایک دوسرے کے اردگرد جمع کردیا جائے اور اخلاقی فضائل وانسانی محاسن کو فضیلت اور شخصیت کی کسوٹی قرار دیا جائے۔ اسی وجہ سے وہ یہ چاہتے تھے کہ سرزمین عرب کی قدیم اور غلط رسومات (مثلاً طبقہ اشراف کی لڑکیوں کی شادی کسی غریب ومفلس کے ساتھ نہ کی جائے) کا جلد از جلد خاتمہ ہوجائے۔ چنانچہ انھوں نے اپنے ہی خاندان سے اس کی شروعات

کی اور اپنی پھوپھی زاد بہن زینب کی شادی جو حضرت عبد المطلب کی نواسی تھیں، اپنے سابقہ اور آزاد شدہ غلام زید کے ساتھ کردی تا کہ لوگوں کو اس حقیقت کا اندازہ ہوجائے کہ ان خیالی سرحدوں کا جلد از جلد خاتمہ ضروری ہے۔ اس طرح پیغمبرؐ کے اس قول کا عملی ثبوت بھی حاصل ہوجائے کہ ''فضیلت کی کسوٹی تقویٰ و پرہیزگاری ہے اور ہر مسلمان لڑکی دوسرے مسلمان مرد کی شان و شوکت کے برابر ہے۔'' چنانچہ پیغمبر اکرمؐ نے خود ہی اس قانون کو عملی جامہ پہنادیا۔

عرب معاشرہ میں پھیلی ہوئی غلط اور بری رسم کی سرکوبی و نابودی کو نگاہ میں رکھتے ہوئے پیغمبر اکرمؐ بذات خود اپنی پھوپھی زاد بہن کے گھر تشریف لے گئے اور ان لوگوں سے زینب کے ساتھ زید کی منگنی کا مطالبہ پیش کیا۔ ابتدائی مرحلہ میں زینب اور ان کے بھائی اس رشتہ کے لئے تیار نہ تھے کیونکہ دور جاہلیت کی فاسد فکریں ابھی ان کے قلوب کی گہرائیوں میں موجود تھیں لیکن دوسری طرف وہ لوگ پیغمبر کی نافرمانی سے بھی پرہیز کرنا چاہتے تھے۔ آخر کار ان لوگوں نے زید کی سابقہ غلامی کو بہانہ قرار دیتے ہوئے پیغمبر کی درخواست کو نامنظور کردیا۔

تھوڑی دیر بعد وحی خداوندی نازل ہوئی جس میں زینب اور ان کے بھائی نے اس سلسلے میں جو حرکت کی تھی اس کی بھرپور مذمت کرتے ہوئے یہ کہا گیا:

'' اور کسی مومن مرد یا عورت کو اختیار نہیں ہے کہ جب خدا و رسول کسی امر کے بارے میں فیصلہ کردیں تو وہ بھی اپنے امر کے بارے میں صاحب اختیار بن جائے اور جو بھی خدا و رسول کی نافرمانی کرے گا وہ بڑی کھلی ہوئی گمراہی میں مبتلا ہوگا۔''[۳]

پیغمبرؐ نے فوراً اس آیہ کریمہ کو ان لوگوں کے سامنے پڑھ دیا۔ زینب اور ان کے بھائی '' عبد اللہ پیغمبر اکرمؐ کی عظمت اور ان کی پاکیزہ شخصیت کے معتقد تھے اور ان کے اعلیٰ مقاصد کو ذہن میں رکھتے ہوئے زینب بنت جحش نے اس شادی کے لئے اپنی رضامندی کا اعلان کردیا اور اس طرح ایک اونچے طبقہ کی اشراف زادی محمد کے غلام کی بیوی ہوگئی جس کو نگاہ میں رکھتے ہوئے اسلام کے حیات آفرین منصوبوں کو عملی جامہ پہنایا گیا اور انسانی معاشرہ

میں پھیلی ہوئی اس بری رسم کو عملی طور پر کچل دیا گیا۔

اپنی زوجہ سے زید کی علیحدگی:

آخر کار بعض اسباب وعوامل کی وجہ سے شادی کے کچھ ہی دنوں بعد طلاق کی نوبت آ گئی۔ بعض لوگوں کا یہ خیال ہے اس جدائی اور علیحدگی میں زینب کے ذاتی جذبات نے نمایاں کردار ادا کیا۔ وہ اپنے شوہر کے حسب ونسب کی پستی اور اپنے خاندان کی عظمت وفضیلت کا تذکرہ برابر اپنے شوہر کے سامنے کیا کرتی تھیں اوراپنی طعنہ زنی کے ذریعہ ان کی زندگی دوبھر کیے رہتی تھیں۔

لیکن قوی احتمال یہ ہے کہ طلاق کا سبب خود زید ہی ہوں کیونکہ ان کے حالات زندگی سے یہ پتہ چلتا ہے کہ وہ تنہائی پسند اور غیر معتدل مزاج کے حامل تھے اسی وجہ سے انھوں نے لگاتار کئی شادیاں کیں اور ہر ایک کو طلاق دیدی اور عمر کے آخری حصہ میں، جب وہ ایک جنگ میں شہید ہوئے، صرف ایک ہی خاتون ان کے عقد میں تھیں اور دیگر بھی ازواج سے انھوں نے مکمل علیحدگی اختیار کرلی تھی۔ یہ لگاتار شادی وطلاق اس بات کی دلیل ہے کہ مزاجی اعتبار سے وہ غیر معتدل انسان تھے۔

اس طلاق میں زید کا بڑا حصہ تھا جس کی دوسری دلیل تیز لہجہ میں پیغمبرؐ کا خطاب ہے۔ جب پیغمبرؐ کو پتہ چلا کہ ان کے منہ بولے بیٹے نے اپنی زوجہ کو طلاق دینے کا فیصلہ کیا ہے تو انہوں نے سخت لہجے میں ڈانٹتے ہوئے فرمایا۔" امسک علیک زوجک واتق اللہ۔"[۱] یعنی اپنی زوجہ کو اپنے ساتھ رکھو اور خداوند عالم کے غضب سے ڈرو۔"

اگر زوجہ پوری طرح قصوروار ہوتی تو اپنی شریک حیات سے زید کی جدائی وعلیحدگی کی وجہ سے ان کے تقویٰ وپرہیزگاری پر قطعی کوئی حرف نہ آتا۔ ان تمام باتوں کے باوجود آخر کار زید نے اپنے فیصلے کو عملی جامہ پہناتے ہوئے زینب سے علیحدگی اختیار کرلی۔

دوسری بری رسم کی نابودی کے لئے شادی:

اس شادی کی بنیادی وجہ کا تجزیہ کرنے سے پہلے نسب کے بارے میں جاننا ضروری

معلوم ہوتا ہے کیونکہ ایک اعلیٰ معیاری سماج میں نسب کا بنیادی اور اہم کردار ہوا کرتا ہے۔ نسب کی حقیقت سے باخبر ہونے کے بعد ''حقیقی فرزند'' اور ایک ''منہ بولے فرزند'' کے درمیان موجود فرق پوری طرح نمایاں ہوجاتا ہے۔ حقیقی بیٹے کا اپنے باپ کے ساتھ تخلیقی رشتہ ہوتا ہے اور بیٹے کی تخلیق میں باپ کو مبدء مادی کی حیثیت حاصل ہوا کرتی ہے۔ بیٹا اپنے باپ کی روحانی اور جسمانی صفات کا مظہر ہوا کرتا ہے اور اسی یکسانیت اور خونی رشتہ کی وجہ سے باپ اور بیٹے ایک دوسرے کی میراث کے حقدار ہوا کرتے ہیں اور شادی و طلاق کے سلسلے میں دونوں مخصوص احکام کے حامل ہیں۔

پس ایک ایسا اہم موضوع جو تخلیقی بنیاد کا حامل ہے، فقط زبان سے چند لفظوں کی ادائیگی کے ذریعہ طے نہیں ہوسکتا ہے۔ کسی آدمی کا منہ بولا بیٹا اس کا حقیقی بیٹا ہرگز نہیں ہوسکتا ہے چہ جائیکہ ایک منہ بولے بیٹے پر میراث ازدواج اور طلاق کے احکام کا اطلاق ایک حقیقی بیٹے کی طرح کیا جائے۔ یہ بات قطعی ناممکن ہے۔ مثلاً ایک حقیقی بیٹے کو اپنے باپ سے میراث حاصل ہوتی ہے اور اسی طرح بیٹے سے باپ کو بھی میراث ملا کرتی ہے۔ یا حقیقی فرزند کی زوجہ طلاق کے بعد بھی باپ کے لئے حرام ہوا کرتی ہے لیکن یہ بات ہرگز نہیں کہی جاسکتی کہ منہ بولے بیٹے کے سلسلے میں بھی اسی شرعی حکم کا اطلاق ہوگا۔ دوسری عبارت میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ منہ بولے فرزند اور حقیقی فرزند پر یکساں حکم کا اطلاق ناممکن اور خلاف عدل ہے۔

مجموعی اعتبار سے نہ صرف یہ کہ یہ شرکت صحیح مبدء کی حامل نہیں ہے۔ بلکہ ایک صالح معاشرہ میں نسب کے بنیادی کردار کے ساتھ کھلواڑ بھی ہے۔

پس اگر پسر خواندگی کا مقصد جزبات اور تعلقات کا اظہار ہے تو یقیناً ایک مناسب اور مستحسن عمل ہے لیکن اگر اس کا مقصد سماجی احکام میں منہ بولے فرزند کو حقیقی فرزند کی طرح شریک کرنا ہے تو یہ بات نہایت نامناسب اور علم و منطق سے کوسوں دور ہے۔

عرب معاشرہ میں منہ بولے فرزند کو حقیقی فرزند کا درجہ دیا جاتا تھا چنانچہ پیغمبرؐ کو اس

بات پر تعینات کیا گیا کہ وہ اپنے منہ بولے فرزند یعنی زید کی مطلقہ زینب کے ساتھ شادی کرکے عرب سماج سے اس بری رسم کو ہمیشہ کے لئے ختم کردیں اور قول وقانون سازی کے بجائے عملی اعتبار سے اس نامناسب رسم کو پوری طرح سرکوب اور نابود کرڈالیں کیونکہ عملی اقدام زیادہ موثر ہوا کرتا ہے۔ پس اس شادی کی اس کے علاوہ کوئی دوسری وجہ نہیں تھی۔ چونکہ اس زمانے میں کسی عام آدمی میں اتنی ہمت نہ تھی کہ وہ سماج میں رائج رسم کی خلاف ورزی کرتے ہوئے منہ بولے فرزند کی طلاق شدہ عورت کے ساتھ شادی کرنے کا فیصلہ کرتا لہذا خداوند عالم اس اہم کارنامہ کے لئے خود پیغمبر اکرمؐ کو منتخب فرمایا۔ چنانچہ ارشاد خداوندی ہوتا ہے:

''اس کے بعد جب زید نے اپنی حاجت پوری کرلی تو ہم نے اس عورت کا عقد تم سے کردیا (تاکہ) مومنین کے لئے منہ بولے بیٹوں کی بیویوں کے ساتھ عقد کرنے میں کوئی حرج نہ رہے جب وہ لوگ اپنی ضرورت پوری کرچکیں اور اللہ کا حکم بہر حال نافذ ہوکر رہتا ہے۔''[۵]

اس شادی نے نہ صرف یہ کہ ایک غلط رسم کو پوری طرح کچل دیا بلکہ یہ سماج میں مساوات اور برابری کا عظیم ترین مظہر بن گئی کیونکہ مذہب اسلام کے رہبر عظیم الشان نے ایک ایسی عورت سے شادی کی تھی جس کا شوہر ان کا آزاد کیا ہوا غلام تھا اور اس زمانے میں اس قسم کی شادی سماج کے اصولوں کے خلاف شمار کی جاتی تھی۔

اس شجاعانہ اقدام کے بعد کوتاہ فکر افراد اور منافقوں نے اعتراض اور تنقید کی بھرمار کردی اور ہر جگہ ایک انہونی بات کی طرح یہ چرچا چھیڑ دیا کہ ''محمد نے منہ بولے بیٹے کی مطلقہ زوجہ کے ساتھ شادی کرلی۔''

خداوند عالم نے اس قسم کے نازیبا افکار کی تردید وسرکوبی کے لئے درج ذیل آیت نازل فرمائی۔

''ما کان محمدٌ ابا احدٍ من رجالکم ولکن رسول اللہ وخاتم النبیین

وکان اللہُ بکل شئی علیماً"

یعنی محمد تمہارے مردوں میں سے کسی ایک کے باپ نہیں لیکن وہ اللہ کے رسول اور سلسلۂ انبیاء کے خاتم ہیں اور اللہ ہر شئے کا خوب جاننے والا ہے۔" [۱]

قرآن مجید نے صرف اسی بیان پر اکتفا نہیں کی بلکہ پیغمبر اکرمؐ نے حکم خداوندی کو عملی جامہ پہنانے کے لئے جس مثالی شجاعت کا مظاہرہ کیا تھا سورۂ احزاب کی ۳۸ ویں اور ۳۹ ویں آیات میں اس کی اعلانیہ ستائش بھی کی۔ ان دو آیتوں میں جو کچھ کہا گیا اس کا خلاصہ یہ ہے کہ "محمد دوسرے پیغمبروں کی طرح ہیں جو الٰہی پیغامات کو لوگوں تک پہونچاتے ہیں اور حکم خداوندی کی اطاعت میں کسی سے خوفزدہ نہیں ہوتے۔" [۲]

یہ ہے زینب کے ساتھ حضرت محمدؐ کی شادی کا فلسفہ: اب یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مستشرقین نے اس سلسلے میں جو نظریہ پیش کیا ہے اس کا بھی تجزیہ کر لیا جائے۔

زینب کی شادی اور مستشرقین:

زید بن حارثہ کی مطلقہ زوجہ زینب کے ساتھ پیغمبرؐ اسلام کی شادی ایک عام، سادہ اور ہر قسم کے ابہام سے دور بات ہے لیکن بعض مستشرقین نے سادہ لوح اور بے خبر لوگوں کو فریب کا شکار بنانے کے لئے اس شادی کو اسلام اور پیغمبرؐ اسلام کے خلاف ایک اہم دستاویز بنالیا ہے اور اس کے ذریعہ پیغمبرؐ کی سیرت سے مکمل واقفیت نہ رکھنے والے لوگوں کے ایمان کو کمزور بنانے کی کوشش کی ہے لہذا یہ لازمی ہوگیا کہ اس جماعت کے لوگوں نے جو خیال پیش کیا ہے اس کا بھرپور تجزیہ کیا جائے۔

یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ سامراجیت سرزمین مشرق پر اپنا مکمل تسلط قائم رکھنے کے لئے صرف فوجی اور اقتصادی طاقت کا استعمال نہیں کرتی ہے بلکہ کبھی کبھی یہ علم وتحقیق کے لباس میں اس سرزمین میں وارد ہوتی ہے اور نہایت سوچے سمجھے منصوبے کے ذریعے لوگوں کو فکری سامراجیت کی غلامی کی زنجیروں میں جکڑنے کی بھرپور کوشش کرتی ہے۔ درحقیقت

مستشرق اسی وسعت طلب سامراجی عنصر کا نام ہے جو مخصوص رنگ وروپ کے ساتھ سماج کے قلب میں نام نہاد اور دانشوروں کے درمیان اپنی سرگرمیوں کا آغاز کرتا ہے اور فاضل جماعت کے لوگوں کی فکروں کو اپنا متوالہ بنانے کے بعد اپنے سامراجی منصوبوں کو عملی جامہ پہنانے میں ہمہ تن سرگرم ہوجاتا ہے۔

ممکن ہے کہ مغربی علم اور تہذیب وتمدن سے والہانہ عشق وعقیدت رکھنے والے اکثر مصنفین اور دانشوروں کو ہماری یہ بات پسند نہ آئے اور وہ ہم لوگوں کو رجعت پرستی اور تعصب کا الزام لگادیں اور یہ سوچیں کہ مذہبی اور قومی تعصب نے ہم لوگوں کو یہ کہنے پر مجبور کردیا ہے۔ لیکن مستشرقین نے تاریخ اسلام میں ایک منظم منصوبے کے تحت جو کاٹ چھانٹ کی ہے اس سے صاف پتہ چلاتا ہے کہ ایک مخصوص مقصد کی تکمیل کی خاطر ان لوگوں نے یہ کام انجام دیا ہے اور ان کے بیانات میں عملی معیار کا فقدان اور قومی ومذہبی مخالفت کی کثرت پائی جاتی ہے اور ان لوگوں نے یہ سارا کام علمی اور تحقیقی لباس میں انجام دیا ہے۔[۸]

ہماری یہ بات اس سلسلے کی بہترین گواہ ہے۔ ان لوگوں نے اس شادی کے سلسلے میں اپنی مخصوص مغربی خیال پردازی کو بروئے کار لاتے ہوئے اس کو عشق اور دلبری کا رنگ دیدیا جبکہ اس کا بنیادی مقصد ''ایک باطل رسم کی سرکوبی ونابودی'' کے علاوہ کچھ نہ تھا۔ ان لوگوں نے ایک ماہر ناول نگار کی طرح ایک جعلی تاریخ کو بڑھا چڑھا کر دنیائے انسانیت کے پاکیزہ ترین انسان سے وابستہ کردیا ہے۔

بہرحال ان لوگوں کے افسانہ نگاری کی بنیاد وہ جملے ہیں جو ابن اثیر نے اور اس سے قبل طبری اور بعض دیگر مفسرین نے نقل کیا ہے اور وہ جملے یہ ہیں ایک دن پیغمبر کی آنکھ اچانک زید کی زوجہ زینب پر پڑی۔ زید نے محسوس کیا کہ پیغمبر زینب کی طرف مائل ہوگئے ہیں۔ زید پیغمبر اکرمؐ سے والہانہ محبت کرتے تھے۔ وہ ایک دن پیغمبرؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور زینب کو طلاق دینے کی تجویز ان کے سامنے پیش کی تاکہ زینب کے ساتھ پیغمبر کی شادی میں ذرہ برابر کوئی

رکاوٹ پیدا نہ ہونے پائے۔ پیغمبر نے زید کو سختی سے منع کیا کہ وہ اپنی زوجہ کو طلاق نہ دیں لیکن زید نے بالآخر اپنی بیوی کو طلاق دیدی اور رسول خدا نے زینب کے ساتھ شادی کرلی۔

لیکن مستشرقین نے اس تاریخی سند کا تحقیقی تجزیہ کرنے کے بجائے اس جعلی تاریخ کے متن کو اس حد تک بڑھا چڑھا کر پیش کیا کہ وہ داستان الف لیلیٰ کا دلچسپ حصہ معلوم ہونے لگے۔ درحقیقت جو لوگ پیغمبرؐ اسلام کی سیرت طیبہ سے بخوبی واقف ہیں وہ اس داستان کو ایک خیالی تخلیق کے علاوہ کچھ نہیں سمجھتے اور اس بیان کو رسول مقبولؐ کی زندگی سے بہت دور پاتے ہیں چنانچہ فخر رازی اور آلوسی جیسے نامور دانشمندوں نے بھی اس تاریخ کی اعلانیہ تکذیب و تردید کی ہے۔ ان لوگوں نے اس داستان کے سلسلے میں اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا ہے:

"اسلام دشمنوں نے اس داستان کی تخلیق کی ہے اور بڑی چالاکی و ہوشیاری کے ساتھ اسے مسلمان مورخین و مصنفین کے درمیان شائع و رائج کردیا ہے۔[۹]

آخر یہ بات کیسے کہی جاسکتی ہے کہ یہ تاریخی ٹکڑا طبری یا ابن اثیر کی عبارت ہے جبکہ اسی کتاب میں جگہ جگہ پر اس کے برعکس باتیں نقل کی ہیں اور پیغمبرؐ کی ذات کو ہر قسم کی آلائش و برائی سے پاک و پاکیزہ ثابت کیا ہے۔

بہر حال سردست ان علامتوں اور شہادتوں کا ذکر لازمی ہوتا ہے جس کی روشنی میں یہ بات واضح ہوجائے کہ اصل موضوع کیا ہے کیونکہ پیغمبرؐ جیسی شخصیت کے بارے میں گڑھی گئی اس داستان کے سلسلے میں دفاعی عبارت کی چنداں ضرورت نہیں رہ جاتی البتہ ان شواہد کی ضرورت سے انکار ناممکن ہے جن کی روشنی میں اصل موضوع کی وضاحت ہوجاتی ہے اور وہ شواہد حسب ذیل ہیں۔

۱۔ مذکورہ تاریخ اسلام اور مسلمانوں کی سند کے خلاف ہے کیونکہ سورۂ احزاب کی ۳۷ ویں آیۂ کریمہ میں قرآن مجید یہ شہادت پیش کرتا ہے کہ "زینب کے ساتھ پیغمبرؐ کی شادی کا مقصد عرب سماج میں رائج بری اور باطل رسم کی مکمل تردید و سرکوبی تھی کیونکہ اس

زمانے میں عرب سماج میں کسی کو یہ حق حاصل نہ تھا کہ وہ اپنے منہ بولے بیٹے کی مطلقہ زوجہ کے ساتھ شادی کر سکے اور یہ کام بھی خداوند عالم کے حکم کے مطابق انجام پایا تھا اور اس میں کسی قسم کی دلبری ودلچسپی کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ صدر اسلام میں کسی نے بھی اس واقعہ کے سلسلے میں ذرہ برابر کوئی اعتراض نہیں کیا۔ دوسری طرف اگر ارشاد قرآن، حقیقت کے خلاف ہوتا تو یہودی عیسائی اور منافقین فوراً اعتراض وتنقید کی بھرمار کر دیتے اور قرآن واسلام کے خلاف ایک مسئلہ کھڑا کر دیتے کیونکہ دشمنوں کی یہ جماعت ہمیشہ تاک میں لگی رہتی تھی پس یہ جماعت اس واقعہ کو ہرگز نظر انداز نہ کرتی۔

۲۔ زینب وہی خاتون ہیں جس نے زید کے ساتھ شادی سے قبل خود پیغمبر اکرمؐ کے ساتھ شادی کرنے کی خواہش ظاہر کی تھی لیکن پیغمبرؐ اکرم نے ان سے اصرار کیا کہ وہ ان کے غلام زید کے ساتھ شادی کے لئے رضامند ہوجائیں۔ اگر پیغمبرؐ زینب کے ساتھ شادی کرنا چاہتے تو زید سے پہلے خود اپنے ساتھ شادی کر لیتے۔ اس سلسلے میں کسی طرح کوئی معمولی سی رکاوٹ موجود نہ تھی۔ اگر وہ زینب سے شادی کرنا چاہتے تھے تو پھر کیوں نہیں کیا؟ وہ ایسا ہرگز نہیں چاہتے تھے اور انہیں یہ معلوم تھا کہ زینب ان کے ساتھ شادی کرنا چاہتی ہیں پھر بھی انھوں نے زینب کی خواہش کا احترام کرنے کے بجائے انہیں زید کے ساتھ شادی کے لئے رضامند کیا۔

سامراجیت کے علمی سپاہیوں کے پاس اس کے علاوہ کوئی دوسرا چارہ کار نہیں رہا کہ وہ تاریخی متن کی تکذیب اور اس میں کاٹ چھانٹ کرتے رہیں۔ ہماری نظر میں پیغمبرؐ کی تاریخ زندگی کے صفحات انتہائی پاک وپاکیزہ ہیں اور اس بات کی چنداں ضرورت محسوس نہیں ہوتی کہ مخالف جماعت کے نازیبا کلمات کو اس جگہ دہرایا جائے۔ جس پیغمبر نے اپنی پچاس سالہ زندگی ایک ایسی عورت کے ساتھ بسر کی ہے جو سن وسال کے اعتبار سے ان سے ۱۸ سال بڑی تھیں، اس کے بارے میں مخالفین کی بیہودہ باتوں کی طرف زیادہ توجہ دینا مناسب نہیں ہے۔

دو جملوں کی وضاحت:

اس بحث کی تکمیل کی خاطر اس سلسلے میں نازل شدہ آیہ کریمہ میں موجود دو جملوں کی وضاحت لازمی معلوم ہوتی ہے کیونکہ بعض کم معلومات کے حامل لوگ ان جملوں کی وجہ سے شک وتردید میں مبتلا ہوچکے ہیں۔ آیہ کریمہ میں منقول ہے۔ ”واذ تقول للذی انعم الله علیه وانعمت علیه امسک علیک زوجک واتق الله۔“ ۲۱

یعنی اور اس وقت کو یاد کرو جب تم اس شخص سے جس پر خدا نے بھی نعمت نازل کی اورتم نے بھی احسان کیا یہ کہہ رہے تھے کہ اپنی زوجہ کو روک کر رکھو اور اللہ سے ڈرو۔“ آیہ کریمہ میں اس حد تک کسی ابہام کی گنجائش نہیں ہے البتہ اس کے بعد میں آنے والے دو جملوں کی وضاحت لازمی معلوم ہوتی ہے۔ وہ جملے یہ ہیں۔

یعنی اورتم اپنے دل میں اس بات کو چھپائے ہوئے تھے جسے خدا ظاہر کرنے والا تھا۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ زید کو اتنی نصیحت کے بعد وہ کونسی بات ہے جس کو پیغمبرؐ چھپائے ہوئے تھے اورخداوند عالم اس کو ظاہر کرنے والا تھا۔

اس جگہ اس خیال کا پیدا ہونا ممکن ہے کہ ویسے تو پیغمبرؐ زید کو نصیحت کررہے تھے کہ وہ زینب کو طلاق نہ دے لیکن دل ہی دل میں وہ اس بات پر راضی تھے کہ زینب زید کے عقد سے آزاد ہوجائے اور وہ خود اس سے شادی کرلیں اس بات کا احتمال بھی ممکن ہے کیونکہ اگر پیغمبرؐ ایسا سوچ رہے تھے تو پھر خداوند عالم نے دوسری آیات میں اس بات کو ظاہر اورنمایاں کیوں نہیں کیا؟ جبکہ اس آیہ کریمہ میں خداوند عالم یہ کہتا ہے کہ پیغمبر کے دل میں جو کچھ بھی ہے وہ اسے آشکار اور نمایاں کرنے والا ہے۔ ارشاد خداوندی ہوتا ہے۔

”الله مبدیه“ یعنی خداوند عالم اس چیز کو ظاہر کرنے والا ہے جسے تم چھپا رہے ہو۔ اس سلسلے میں مفسروں کا قول ہے کہ پیغمبر اکرمؐ جس چیز کو پوشیدہ رکھے ہوئے تھے وہ وہی وحی الٰہی ہے جس کو خداوند عالم نے ان پر نازل کی تھی۔ وضاحت یہ ہے کہ خداوند عالم نے ان پر

وحی نازل کی تھی زید اپنی زوجہ کو طلاق دیدیں گے اور تم ایک باطل سنت کی تردید وسرکوبی کی خاطر (جس کے بموجب منہ بولے لڑکے کی مطلقہ زوجہ سے شادی کو حرام قرار دیدیا گیا ہے) تم اس سے شادی کروگے۔ یہی وجہ تھی کہ جب وہ زید کو طلاق نہ دینے کی نصیحت کررہے تھے اس وحی الٰہی کی طرف متوجہ تھے جبکہ زید اور دیگر افراد سے یہ بات پوشیدہ تھی لیکن خداوند عالم مذکورہ بالا جملہ میں پیغمبرؐ کو بتا دیتا ہے کہ جو بات تمہارے دل میں، خداوند عالم اس کو ظاہر کردے گا اور تمہارے چھپانے سے وہ بات پوشیدہ نہ رہے گی۔

اس بات کی شہادت کے لئے اتنا کافی ہے کہ قرآن اس آیت کے ذیل میں بات کو واضح کرتے ہوئے ارشاد فرماتا ہے۔

فلماقضیٰ زید منها وطراً زوجناکها لکی لا یکون علی المومنین حرج فی آزواج ادعیائهم۔"

جس وقت زید نے اپنی زوجہ کو طلاق دیدی، ہم نے تم کو حکم دیا کہ اس کی زوجہ کے ساتھ شادی کرلو تا کہ مومنین پر اپنے منہ بولے بیٹے کی مطلقہ ازواج کے ساتھ شادی نہ کرنے کی پابندی باقی نہ رہ جائے۔

اس سے صاف ظاہر ہوجاتا ہے کہ پیغمبرؐ اکرم نے جو چیز پوشیدہ رکھی تھی وہ وہی وحی الٰہی تھی جس میں طلاق کے بعد اپنے منہ بولے بیٹے کی زوجہ کے ساتھ شادی نہ کرنے کی غلط رسم کی سرکوبی کی بات کہی گئی تھی اور اس باطل رسم کی نابودی کے لئے پیغمبرؐ کا انتخاب کیا گیا تھا۔

۲۔ وتخشیٰ الناس واللہ احق ان تخشاہ۔"

یعنی اور تمہیں لوگوں کے طعنوں کا خوف تھا حالانکہ خدا زیادہ حقدار ہے کہ اس سے ڈرا جائے۔

یہ مذکورہ جملہ کا دوسرا حصہ ہے جس میں پہلے حصہ کے مقابلہ میں ابہام زیادہ کم ہے کیونکہ برسوں سے چلی آرہی اس قدیم رسم کو کہ منہ بولے بیٹے کی مطلقہ زوجہ کے ساتھ عقد نہ

کیا جانا چاہئے، کو توڑتے وقت پیغمبرؐ کے دل میں خوف بے چینی کی موجودگی ایک فطری امر تھا۔

اگر پیغمبرؐ کے دل میں کوئی خوف یا خطرہ پیدا ہوا تھا تو اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ سوچ رہے تھے کہ عرب سماج کے لوگوں نے ابھی ابھی جہالت اور فاسد وپلید افکار وخیالات سے نجات حاصل کی ہے اور اس کام کے بعد وہ لوگ یہ کہنے لگیں گے کہ پیغمبرؐ نے ایک نامناسب کام کرڈالا اگر چہ حقیقت میں وہ کام نامناسب نہیں بلکہ حکم الٰہی کے مطابق ہے۔

حوالے:

۱۔کتاب تاریخ الخمیس اس حادثہ کو تاریخی اعتبار سے ماہ ذی القعدہ ۵ھ سے مربوط جانتا ہے لیکن سماجی محاسبات کے مطابق یہ بات صحیح نہیں معلوم ہوتی ہے کیونکہ ۲۴ رشوال ۵ھ سے ۱۹ر ذی الحجہ کے دوران پیغمبرؐ جنگ احزاب اور ''بنی قریظہ'' میں مصروف تھے۔ ایسے حالات میں شادی اور ازدواجی مراسم بہت بعید معلوم ہوتا ہے۔بہر حال اگر زینب کے ساتھ پیغمبرؐ اکرم کا عقد ہجرت کے پانچویں سال میں ہوا ہے تو یہ امر یقینی ہے کہ یہ عقد مذکورہ واقعات سے قبل رونما ہوا۔ اسی بنیاد پر مولف نے اس واقعہ کو جنگ احزاب اور بنی قریظہ سے قبل تحریر کیا ہے۔

۲۔''اسد الغابۃ''، ''الاستیعاب'' و'' الاصابۃ'' میں مادہ زید میں ملاحظہ کیجئے۔

۳۔وماکان.....ضلالاً مبینا۔'' سورہ احزاب آیہ ۳۶

۴۔سورہ احزاب آیہ ۳۷

۵۔'' فلما قضیٰ زید منھا.....وکان امر اللہ مفعولا۔'' سورہ احزاب ۳۷۔۳۸

۶۔سورہ احزاب آیہ ۴۰

۷۔آیات کا متن ملاحظہ ہو۔'' وماکان علی النبی کفی اللہ حسیبا سورہ احزاب آیہ ۳۸/۳۹

۸۔تاریخ کامل جلد ۲ ص ۱۲۱

۹۔''مفاتیح الغیب رازی'' جلد ۲۵ ص ۲۱۲، روح المعانی'' جزء ۲۲/ ۲۳۔۲۴

۱۰۔سورہ احزاب آیہ ۳۷

❋❋❋❋

ڈاکٹر احسان اللہ فہد، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

انسانی حقوق اور احادیث نبوی

اسلام میں بنیادی حقوق کا تصور اتنا ہی قدیم ہے جتنا انسان کا وجود قدیم ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے انسان کی طبعی زندگی کے لئے جس طرح ہوا، پانی، خوراک، روشنی اور دوسرے بے شمار اسباب فراہم کئے ہیں اسی طرح معاشرتی زندگی بسر کرنے کے لئے ایک ضابطہ حیات بھی آغاز زندگی کے ساتھ عطا کیا ہے۔ انسان کو اس دنیا میں بھیجنے اور منصب خلافت پر فائز کرنے سے پہلے اسے حقوق فرائض اور آداب زندگی کا شعور عطا کردیا گیا تھا۔ حضرت آدمؑ نے اپنی زندگی کا آغاز مکمل علم کی روشنی میں کیا جس کی وضاحت خود قرآن کریم نے کی ہے:

وعلم آدم الاسماء کلھا[1] (ترجمہ) اور اللہ نے حضرت آدمؑ کو ساری چیزوں کے نام سکھائے۔

اس آیت سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ حضرت آدمؑ کو جو علم عطا کیا گیا تھا وہ علم کامل تھا اور آپؑ کو ان تمام چیزوں کے نام سکھادیئے گئے تھے جن چیزوں سے آپ کو اس کائنات میں واسطہ پڑنا تھا۔ اس علم میں یہ بات لازمی طور سے شامل تھی کہ انسان کو مختلف اشیاء سے متعلق اپنے حقوق فرائض کا بھی شعور ہو۔ چنانچہ حضرت آدمؑ کی زندگی ہی میں جب حق کا پہلا مسئلہ پیدا ہوا تو ساتھ ہی یہ حقیقت بھی عیاں ہوگئی کہ انسان محض اپنے قیاس وگمان یا وجدان کی بناپر نہیں بلکہ خدا کے مقرر کردہ ضابطہ کی وجہ سے ان حقوق کے احترام کا شعور رکھتا تھا، قابیل نے جب خدا کے حضور اپنی نذر قبول نہ ہونے کے بعد ہابیل کو قتل کی

دھمکی دی تو ہابیل نے جواب دیا:

لئن بسطت الی یدک لتقتلنی ماانا بباسط یدی الیک لاقتلنک انی اخاف اللہ رب العالمین۔ انی ارید ان تبوأ باثمی واثمک فتکون من اصحاب النار وذالک جزاء الظالمین۔[۲]

(ترجمہ) اگر تو مجھے قتل کرنے کے لئے ہاتھ اٹھائے گا تو میں تجھے قتل کرنے کے لئے ہاتھ نہیں اٹھاؤں گا۔ میں رب العالمین سے ڈرتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ میرا اور اپنا گناہ تو ہی سمیٹ لے اور دوزخی بن کر رہے۔ ظالموں کے ظلم کا یہی ٹھیک بدلہ ہے۔

قرآن کے الفاظ صاف طور سے نشاندہی کر رہے ہیں کہ ہابیل کو انسانی جان کے احترام وتحفظ سے متعلق اللہ تعالیٰ کی ہدایت کا علم تھا۔ وہ جانتا تھا کہ یہ ایک گناہ کا کام ہے اور اس کا مرتکب جہنم میں ڈالا جائے گا۔ اس نے محض خوف خدا کی بناء پر اپنی جان دے دی۔ مگر بھائی پر ہاتھ اٹھانا گوارہ نہ کیا۔

حضرت آدمؑ کو خداء بندگان خدا اور دوسری مخلوقات کے سلسلے میں حقوق وفرائض کا جو ضابطہ عطا کیا گیا تھا وہ انسانی زندگی کے مختلف ارتقائی مراحل میں وقت کے مسائل اور تقاضوں کے مطابق نئی تشریحات وتوضیحات اور اضافی احکام کے ساتھ حضرت آدمؑ سے لے کر حضرت محمد مصطفیٰؐ تک مبعوث ہونے والے تمام انبیائے کرام کے ذریعہ انسانیت کو اپنی ہدایات ورہنمائی کے لئے مسلسل ملتا رہا۔ انسانی تعلقات کے دائرے جوں جوں وسیع ہوتے گئے ان کو مضبوط کرنے والے احکام بھی نازل ہوتے رہے۔ تا آنکہ آخر الزماں حضرت محمدؐ پر انسانیت کی تعلیم وتربیت کا سلسلہ مکمل ہوگیا اور اعلان کردیا گیا:

الیو م اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی ورضیت لکم الاسلام دینا۔[۳]

(ترجمہ) آج میں نے تمہارے دین کو تمہارے لئے مکمل کردیا اور اپنی نعمت تم پر تمام

کردی اور تمہارے لئے اسلام کو تمہارے دین کی حیثیت سے قبول کرلیا ہے۔

حضرت آدمؑ سے لیکر حضرت محمد مصطفیٰؐ تک تمام انبیائے کرام بلا کسی تفریق کے ایک ہی دین کی طرف لوگوں کو دعوت دیتے رہے۔ ان کا مشن ایک تھا وہ ایک ہی ضابطۂ حیات کے علمبردار تھے اور یہ ضابطہ حیات ان کا مقرر کردہ نہیں بلکہ انھیں منصب رسالت پر مامور کرنے والے مقتدر اعلیٰ کا عطا کردہ تھا۔قرآن کا فرمان ہے:

شرع لکم من الدین ماوصیٰ به نوحا والذی اوحینا الیک وماوصینا به ابراهیم وموسیٰ وعیسیٰ ان اقیموا الدین ولاتتفرقوا فیه۔[۴]

(ترجمہ) اللہ نے مقرر کردیا ہے تمہارے لئے وہ دین جس کی ہدایت کی تھی اس نے نوحؑ کو اور جس کی وحی کی گئی (اے محمدؐ) تمہاری طرف اور جس کی ہدایت کی گئی ابراہیمؑ اور موسیٰؑ اور عیسیٰؑ کو اس تائید کے ساتھ کہ تم لوگ قائم کرو اس دین کو اور اس میں متفرق نہ ہوجاؤ۔

یہ دین محض عقائد کی اصلاح پر مبنی نہیں تھا بلکہ اصلاح عقائد سے لے کر زندگی کے تمام معاملات کی درستگی تک پھیلا ہوا تھا۔ اور اس میں دین اور اس کی مفصل ہدایات موجود تھیں۔

قرآن کا فرمان ہے:

واذ اخذنا میثاق بنی اسرائیل لا تعبدون الا الله وبالوالدین احسانا وذی القربیٰ والیتمیٰ والمسکین وقولوا للناس حسنا واقیموالصلوٰة و آتو الزکوٰة ثم تولیتم الا قلیلاً منکم وانتم معرضون ۔ واذاخذنا میثاقکم لاتسفکون دمائکم ولاتخرجون انفسکم من دیارکم ثم اقررتم وانتم تشهدون۔[۵]

(ترجمہ) یاد کرو اسرائیل کی اولاد سے ہم نے پختہ عہد لیا تھا کہ اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرنا۔ ماں باپ کے ساتھ، رشتہ داروں کے ساتھ، یتیموں اور مسکینوں کے ساتھ نیک سلوک کرنا، لوگوں سے بھلی بات کہنا، نماز قائم کرنا اور زکوٰۃ دینا مگر تھوڑے آدمیوں کے سوا تم سب اس عہد سے پھرے ہوئے تھے۔ پھر ذرا یاد کرو ہم نے تم سے عہد لیا تھا کہ آپس میں ایک

دوسرے کا خون نہ بہانا اور نہ ایک دوسرے کو گھر سے بے گھر کرنا پھر تم نے اقرار کیا اور تم اس کے شاہد بنے۔

قرآن کی پیش کردہ انسانی حقوق کی یہ تاریخ اس بات کا بین ثبوت ہے کہ اسلام میں بنیادی حقوق کا تصور ابتدائے آفرینش سے موجود ہے۔ اسکے مقابلے میں اہل مغرب کا دعویٰ ہے کہ بنیادی حقوق کی تاریخ صرف تین چار سو سال پرانی ہے اور انھوں نے اس عرصے میں بڑی جدوجہد اور کاوشوں سے جو کچھ حاصل کیا ہے آج پوری دنیا اس سے فیضیاب ہورہی ہے لیکن قرآن جو تاریخ ہمارے سامنے پیش کررہا ہے کہ جس دن اولین انسان نے اس دنیا میں قدم رکھا تھا بنیادی حقوق اسی دن سے اس کے احساس وشعور کا حصہ ہیں اور ان کا حصول وتعین اس کا اپنا کارنامہ نہیں بلکہ خود مقتدر اعلیٰ نے اسے بتدریج یہ حقوق عطا کئے ہیں آج جہاں کہیں ان حقوق کی صدائے بازگشت سنائی دے رہی ہے وہاں الٰہی تعلیمات کے پرتو ہی سے بنیادی حقوق کا شعور بیدار ہوا ہے۔

اسلامی ریاست میں بنیادی حقوق کا دائرہ نہایت وسیع ہے۔ دنیا کے عام دساتیر کی طرح یہ فرد اور ریاست کے باہمی تعلق تک محدود نہیں ہے بلکہ قرآن وحدیث کے دستور کا دائرہ اطلاق انسان کی پوری زندگی پر محیط ہے۔ قرآن وحدیث نے عقائد، عبادات اخلاق، معاشرت، تمدن معیشت، سیاست، عدالت صلح وجنگ اور زندگی کے دوسرے شعبوں میں پھیلے ہوئے بے شمار تعلقات کو اس طرح منضبط کردیا ہے کہ ریاست کے لئے قانون سازی کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہی ہے۔ قرآن کریم اور سنت مطہرہ نے ایک فرد کے لئے جو حقوق مقرر کردیئے ہیں وہ جزو دستور ہوئے۔ ریاست کے اختیارات قانون سازی سے ماوراء ہونے اور عدلیہ کے ذریعہ قابل حصول ہونے کی بناء پر بلا استثناء سب کے سب بنیادی حقوق ہیں۔ ان حقوق میں صرف تحفظ جان، تحفظ عزت ملکیت حصول انصاف، مساوات، آزادی اظہار رائے اور آزادی عقیدہ جیسے حقوق ہی شامل نہیں ہیں بلکہ ایک نوزائدہ بچے کی مدت رضاعت سے

لے کر ایک عورت کے حق مہر تک کے وہ تمام حقوق شامل ہیں جو خدا اور اس کے رسول نے مقرر کر دیئے ہیں۔ اور جن میں اب کسی ردوبدل کا اختیار نہیں ہے۔قرآن نے ان کو ''حدود اللہ'' کی اصطلاح سے تعبیر کیا ہے۔ یہ حدود فرد اور ریاست پر یکساں عائد ہوتی ہیں۔

(ا) تحفظ جان:

اسلام نے انسانی جان کو انتہائی محترم قرار دیا ہے اور ایک انسان کے قتل کو تمام انسانوں کا قتل قرار دے کر تحفظ جان کی اہمیت پر جس قدر زور دیا ہے اس کی مثال کسی اور مذہب میں موجود نہیں ہے :من قتل نفسا بغیر نفس اوفساد فی الارض فکانما قتل الناس جمیعا ومن احیاھا فکانما احیا الناس جمیعا۔[۱]

(ترجمہ) جس نے کسی انسان کو خون کے بدلے یا زمین میں فساد پھیلانے کے سوا کسی اور وجہ سے قتل کیا اس نے گویا تمام انسانوں کو قتل کر دیا۔ اور جس نے کسی کی جان بچائی اس نے گویا تمام انسانوں کو زندگی بخش دی۔

قرآن کریم کے اس واضح حکم کی تاکید وتشریح اللہ کے رسولؐ نے متعدد مواقع پر کی ہے خطبۂ حجۃ الوداع میں آپؐ نے فرمایا:

''لوگو تمہارے خون ومال اور عزتیں ایک دوسرے پر قطعا حرام کر دی گئیں۔ ہمیشہ کے لئے ان چیزوں کی حرمت ایسی ہی ہے جیسی آج تمہارے اس دن کی اور اس ماہ مبارک (ذی الحجہ) کی حرمت اس شہر (مکہ) میں ہے۔خبردار ایسا نہ ہو کہ تم میرے بعد ایک دوسرے کی گردن مارنے لگو اور کفار کے زمرے میں شامل ہو جاؤ'' بعد ازاں آپ نے اپنی اس نصیحت پر عمل کی اولین مثال پیش کرتے ہوئے فرمایا:

''زمانۂ جاہلیت کے سارے خون کا لعدم ہیں۔ پہلا انتقام جسے میں کالعدم قرار دیتا ہوں میرے اپنے خاندان کا ہے۔ ربیعہ بن الحارث کے دودھ پیتے بیٹے کا خون جسے بنی ہذیل نے مار ڈالا تھا۔ اب میں معاف کرتا ہوں ے

اسلام میں انسانی جان کی حرمت اور اس معاملہ میں اسلامی حکومت کے طرز عمل کا صحیح اندازہ ہمیں فتح مکہ کے موقع پر عفو عام کے واقعہ سے ہوتا ہے۔کفار مکہ کی حیثیت جب تک حملہ آور کی رہی ان کے ساتھ ایک حملہ آور کا سا سلوک کیا گیا۔لیکن فتح مکہ کی صورت میں چونکہ کفار مکہ کی پوزیشن بدل گئی۔ان کی ریاست کے خاتمے کے ساتھ ان کا جارحانہ کردار اور مدینہ پر حملہ آور کی حیثیت کا بھی خاتمہ ہوگیا۔وہ مفتوحہ علاقہ کے باشندوں کی حیثیت سے خود اسلامی ریاست کے زیر اقتدار آکر اس کے شہری بن گئے تو آپ نے خانہ کعبہ کے سامنے لوگوں کا اجتماع کیا اور آپ نے ان سے خطاب کرکے فرمایا جانتے ہو میں آج تم سے کیا سلوک کرنے والا ہوں۔مجمع سے آواز آئی۔آپ شریف بھائی ہیں اور شریف بھائی کے بیٹے ہیں۔حضورؐ نے جواباً فرمایا تم پر آج کوئی گرفت نہیں جاؤ آج تم سب آزاد ہو۔"[۸]

(۲) تحفظ ملکیت کا حق:

اسلامی ریاست میں ایسی تمام نجی املاک جو جائز ذرائع سے حاصل شدہ ہوں جن سے شریعت کے مقرر کردہ تمام حقوق وواجبات ادا کردیئے ہوں اور حکومت کے عائد کردہ مستقل اور عارضی نوعیت کے ٹیکس بھی ادا کیے جاچکے ہوں حکومت کی مداخلت سے قطعی محفوظ ہوں گی۔اور ان سے متعلق مالک کو حسب ذیل حقوق حاصل ہوں گے۔(الف) استعمال اور تصرف کا حق (ب) مزید نفع کمانے کے لئے کاروبار میں لگانے کا حق (ج) انتقال ملکیت کا حق (د) تحفظ ملکیت کا حق۔

حضور اکرمؐ نے مدینہ میں مسجد نبوی کے لئے جو زمین منتخب کی وہ دو یتیم بچوں کی ملکیت تھی۔انھوں نے اپنی افتادہ زمین بلا قیمت دینے کی پیش کش کی۔مگر حضورؐ نے اس کی قیمت کا تخمینہ لگوایا اور اس وقت کی عام شرح کے مطابق معاوضہ دے کر زمین حاصل کی۔[۹]

(۳) تحفظ آبرو کا حق:

اسلامی ریاست اپنے شہری کی عزت وآبرو کا تحفظ بھی فراہم کرتی ہے۔خطبہ حجۃ

الوداع میں حضور اکرمؐ نے جان ومال کے ساتھ ہی حرمت آبرو کا بھی حکم دیا تھا اسکے علاوہ انھوں نے اپنے متعدد ارشادات میں لوگوں کو بلا وجہ مارنے پیٹنے اور ان کی توہین وتذلیل کرنے سے منع فرمایا ہے۔ ایک بار آپؐ نے فرمایا:

''مسلمان کی پشت محترم ہے (اس کی پٹائی نہیں کی جاسکتی) لا یہ کہ اس نے سزا کے قابل جرم کیا ہو۔ جس نے بلاوجہ کسی مسلمان کو مارا اللہ تعالی اس پر سخت غضبناک ہوگا۔ [۱۰] (طبرانی)

(۴) نجی زندگی کا تحفظ:

اسلامی ریاست میں شہریوں کی نجی زندگی کو مکمل تحفظ فراہم کیا گیا ہے۔ وہ گھروں کی چہار دیواری میں مکمل طور سے محفوظ ہیں۔ قرآن نے دوسروں کی نجی زندگیوں میں دخیل ہونے، ایک دوسرے کے راز ٹٹولنے، نجی معاملات کی ٹوہ لینے اور کھوج کرید میں پڑے رہنے سے سختی سے منع کیا ہے۔ اسی وجہ سے اللہ کے رسولؐ نے ارشاد فرمایا:

جس شخص نے کسی کے عیب کو دیکھا اور اس کی پردہ پوشی کی اس نے گویا ایک زندہ درگور انسان کو زندہ کردیا۔ [۱۱] (ابوداؤد، نسائی)

اس سلسلے میں خلیفہ دوم کے ایک واقعہ سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اسلامی ریاست کے امیر کی حدود مداخلت کیا ہیں۔ ایک مرتبہ رات کے وقت آپ نے ایک شخص کی آواز سنی جو اپنے گھر میں گا رہا تھا۔ آپ کو شک ہوا اور دیوار پر چڑھ گئے دیکھا کہ وہاں شراب بھی موجود ہے اور ایک عورت بھی۔ آپ نے پکار کر کہا اے دشمن خدا کیا تو نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ تو اللہ کی نافرمانی کرے گا اور اللہ تیرا پردہ فاش نہ کرے گا۔ اس نے جواب دیا۔ امیر المومنین جلدی نہ کیجئے۔ اگر میں نے ایک گناہ کیا ہے تو آپ نے تین گناہ کئے ہیں۔ اللہ نے تجسس سے منع کیا تھا اور آپ نے تجسس کیا۔ اللہ نے حکم دیا تھا کہ گھروں میں ان کے دروازے سے آؤ اور آپ دیوار پر چڑھ کر آئے۔ اللہ نے حکم دیا تھا کہ اپنے گھروں کے سوا دوسروں کے گھروں میں بغیر اجازت نہ جاؤ اور آپ میری اجازت کے بغیر میرے گھر میں تشریف لے آئے۔ یہ سن کر

حضرت عمرؓ نے اپنی غلطی کا اعتراف کیا اور اس کے خلاف کوئی کاروائی نہ کی البتہ اس سے وعدہ لیا کہ وہ بھلائی کی راہ اختیار کرے گا۔ ۱۲

(۵) شخصی آزادی کا تحفظ:

اسلامی ریاست مجرم کو کھلی عدالت میں جرم ثابت کئے بغیر محض شکوک وشبہات کی بنیاد پر قید کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔ آج ''احتا عی نظر بندی'' کے زیر عنوان ''ریاست کی سلامتی'' کے نام سے جو کچھ ہو رہا ہے اسلامی قانون میں اس کی قطعاً گنجائش نہیں۔ اسلام کا انداز فکر اس معاملہ میں یہ ہے کہ سزا سے حتی الامکان گریز کیا جائے اور اسباب وشواہد سزا کے لئے نہیں بلکہ برأت کے لئے ڈھونڈے جائیں۔ حضور اکرمؐ کا ارشاد گرامی ہے کہ:

جس حد تک ممکن ہو مسلمانوں (شہریوں) کو سزا سے بچاؤ کوئی گنجائش بھی نکلتی ہو تو انہیں چھوڑ دو۔ یہ بات کہ امام کسی شخص کو چھوڑ دینے میں غلطی کر جائے۔ اس بات سے بہتر ہے کہ وہ اسکو سزا دینے میں غلطی کر جائے ۱۳ (ترمذی)

۶۔ ظلم کے خلاف احتجاج کا حق:

اسلام نے اسلامی ریاست میں رہنے والے شہریوں کو یہ حق دیا ہے کہ اگر ان کے اوپر ظلم ہو تو اس کے خلاف آواز اٹھائیں۔ ظالم سے ہرگز نہ دبیں اور نہ ہی اس ظلم کو برداشت کریں۔ جنگ بدر کے موقع پر آپؐ ایک تیر سے مجاہدین کی صفیں سیدھی کر رہے تھے۔ حضرت سواد بن غزیہ صف سے آگے تھے۔ آپؐ نے ٹھوکا دے کر فرمایا سواد برابر کھڑے رہو۔ سواد بولے یا رسول اللہؐ! آپؐ نے مجھ کو تکلیف دی حالانکہ اللہ نے آپ کو حق وانصاف کے لئے مبعوث فرمایا ہے۔ پس آپؐ اجازت دیجئے کہ میں آپ سے بدلہ لوں۔ رسول اللہؐ نے فوراً شکم مبارک کھول کر فرمایا سواد اپنا بدلہ لے لو۔ سواد دوڑ کر جسم اطہر سے لپٹ گئے اور شکم مبارک کو چوم لیا۔ ۱۴

(۷) آزادانہ اظہار رائے کا حق:

اسلام نے شہریوں کو اس بات کا بھی حق دیا ہے کہ ملک کے مسائل ومعاملات سے متعلق اپنی رائے کا آزادانہ اظہار کریں۔ حضورؐ کا معمول تھا کہ مختلف معاملات میں صحابہ کرام سے رائے لیتے تھے اور اظہار رائے کے لئے ان کی حوصلہ افزائی کرتے۔ جنگ احد کے موقع پر آپ کی اور معمر وجلیل القدر صحابہ کرام کی رائے تھی کہ مدینہ کے اندر رہ کر دشمن کا مقابلہ کیا جائے مگر حضرت حمزہ اور نوجوانوں کی رائے یہ ہوئی کہ باہر نکل کر جنگ کی جائے۔ آپ نے دیکھا کہ اکثریت باہر نکل کر جنگ کرنے کے حق میں ہے تو اسی کے مطابق عزم جنگ کیا اور ہتھیار بندی کے لئے حجرہ میں تشریف لے گئے۔ اس دوران معمر صحابہ نے نوجوانوں کو عار دلائی کہ تم نے پیغمبرؐ خدا کی رائے کا لحاظ کئے بغیر آپ کو تکلیف میں ڈالا۔ یہ سن کر نوجوان متاثر ہوئے اور معذرت کے لئے حجرہ کے سامنے جمع ہوگئے آپؐ باہر تشریف لائے اور ان کی معذرت سنی۔ تو فرمایا۔ ”عزم کے بعد اب نبی کی شان نہیں ہے کہ مقصد کو حاصل کئے بغیر غیر مسلح ہوجائے۔ چلو اب مدینہ کے باہر ہی میدان جنگ قائم ہوگا۔ [۱۵]

ایک غزوہ میں رسول اللہؐ نے مسلمانوں کو ہدایت فرمائی کہ فلاں فلاں مقام پر قیام فرمائیں۔ اور پڑاو ڈالیں۔ ایک صحابی نے دریافت کیا۔ یہ ارشاد وحی سے ہے یا آپ کی ذاتی رائے سے آپؐ نے فرمایا یہ میری ذاتی رائے ہے۔ صحابی نے عرض کیا جنگ کیلئے یہ منزل مناسب نہیں اس کے بجائے فلاں فلاں منزل مناسب ہوگی۔ چنانچہ رسول اللہؐ نے اسی رائے کو پسند فرمایا۔ [۱۶]

(۸) مساوات کا حق:

قرآن کریم دنیا کے تمام انسانوں کو بحیثیت انسان مساوی قرار دیتا ہے اور اعلان کرتا ہے کہ ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور پھر تمہاری قومیں اور برداریاں بنادیں تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچانو۔ درحقیقت اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو تمہارے اندر سب سے زیادہ پرہیز گار ہے۔ [۱۷]

اسی بات کو رسول اللہؐ نے حجۃ الوداع کے خطبے میں اسی طرح بیان فرمایا ہے۔ "کسی عربی کو کسی عجمی پر کوئی فضیلت نہیں اور نہ کسی عجمی کو عربی پر، نہ کسی گورے کو کالے پر اور نہ کالے کو گورے پر ماسوا تقویٰ کے تم سب آدم کی اولاد ہو اور آدم مٹی سے بنائے گئے تھے۔

قرآن وحدیث کی رو سے اسلامی ریاست کے تمام شہری مساوی الحیثیت ہوں گے۔ معاشرتی زندگی میں بھی تقویٰ کے علاوہ کوئی اور معیار فضیلت نہیں ہے۔ رسول اللہؐ کے عہد میں بکثرت ایسی مثالیں ملتی ہیں جن میں آقا اور غلام، حکمراں اور شہری، امیر اور غریب اور مسلم اور غیر مسلم کے درمیان انصاف کے معاملہ میں اصول مساوات پر سختی سے عمل کیا گیا قریش کی ایک عورت فاطمہ نے چوری کی۔ حضرت اسامہ نے اسے معاف کر دینے کی سفارش کی تو آپؐ نے سختی کے ساتھ فرمایا: اے اسامہ! اللہ کی مقرر کردہ سزائیں سفارش کر کے مداخلت کرتے ہو۔ خبردار آئندہ ایسی غلطی نہ کرنا۔ پھر آپؐ نے حضرت بلال کو حکم دیا کہ مسلمانوں کو مسجد میں جمع کریں۔ مسلمان جمع ہوگئے تو آپؐ نے ان سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا تم سے پہلے جو امتیں گزری ہیں وہ اس لئے تباہ ہوئیں کہ وہ کم درجے کے لوگوں کو تو قانون کے مطابق سزا دیتی تھیں اور اونچے درجے کے لوگوں کو چھوڑ دیتی تھیں۔ قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے اگر محمدؐ کی بیٹی فاطمہ(س) بھی ایسا کرتی تو میں اس کا بھی ہاتھ کاٹ دیتا۔[۱۸]

(۹) حصول انصاف کا حق:

اسلامی ریاست میں رہنے والا ہر شہری اس بات کا حقدار ہے کہ اگر اس کے اوپر ظلم کیا گیا ہے تو وہ اپنے لئے انصاف کو یقینی بنائے قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو ہدایت کی ہے کہ آپ یہ اعلان کردیں:

وامرت لاعدل بینکم [۱۹] (ترجمہ) اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں تمہارے درمیان عدل قائم کروں۔

(۱۰) معصیت سے اجتناب کا حق:

اسلامی ریاست کا ہر شہری اس بات کا بھی حقدار ہے کہ اگر اسکو معصیت کا حکم دیا جائے تو وہ اس کو ماننے سے انکار کردے۔ رسول اللہؐ نے اس جانب اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ ''امراء کی اطاعت واجب ہے جب تک اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کا حکم نہ دیا جائے۔ جب اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کا حکم دیا جائے تو پھر نہ سننا ہے اور نہ ماننا ہے۔'' ۲۰ بخاری

مندرجہ بالا بنیادی حقوق بلا امتیاز مذہب وعقیدہ تمام شہریوں کو یکساں طور پر حاصل ہیں۔لیکن اسلام نے ہمیں بنیادی حقوق کا جو تصور دیا ہے اس کے مطابق اسلامی ریاست میں مسلمانوں کے لئے وہ تمام حقوق بنیادی قرار دیئے جائیں گے جو قرآن وسنت کے طے کردہ ہیں۔ ان میں وراثت ، ملکیت نفقہ، مہر نکاح، طلاق، خلع ، بیع وشریٰ ور زندگی کے دوسرے معاملات سے متعلق وہ تمام حقوق شامل ہیں جو شریعت نے ہمیشہ کے لئے متعین کردیئے ہیں اور جن میں قانون سازی کے ذریعہ اب کوئی ترمیم وتنسیخ نہیں ہوسکتی اور ان حقوق کو غصب کرنے کی صورت میں عدلیہ کے ذریعہ قابل حصول ہیں۔ مثال کے طور پر کسی عورت کو اگر ایسی صورت میں جب اس کی گود میں بچہ ہو طلاق دے دی جائے تو قرآن بچہ، مطلقہ عورت اور شوہر کے درمیان حقوق فرائض کا یہ ضابطہ متعین کرتا ہے۔

والوالدات یرضعن اولادھن حولین کاملین لمن اراد ان یتم الرضاعة وعلی المولدله رزقھن و کسوتھن بالمعروف لاتکلف نفس الا وسعھا لا تضار والدة بولدھا ولامودله بولده وعلیٰ الوارث مثل ذالک فان اراد فصالا عن تراض منھما وتشاور فلاجناح علیھا وان اردتم ان تسترضعوا اولادکم فلاجناح علیکم اذاسلمتم ماآتیتم بالمعروف واتقوالله واعلموا ان الله بمایعلمون بصیر۔۲۱

(ترجمہ) جو باپ چاہتے ہوں کہ ان کی اولاد پوری مدت رضاعت تک دودھ پیئے تو

مائیں اپنے بچوں کو کامل دوسال دودھ پلائیں ۔ اس صورت میں بچے کے باپ کو معروف طریقے سے انھیں کھانا کپڑا دینا ہوگا۔ مگر کسی پر اس کی وسعت سے بڑھ کر بار نہ ڈالنا چاہیے۔ نہ تو ماں کو اس وجہ سے تکلیف میں ڈال دیا جائے کہ بچہ اسکا ہے۔ اور نہ باپ ہی کو اس وجہ سے تنگ کیا جائے کہ بچہ اس کا ہے دودھ پلانے والی کا یہ حق جیسا بچے کا باپ پر ہے ویسا ہی اس کے وارث پر بھی ہے لیکن فریقین اگر باہمی رضامندی اور مشورے سے دودھ چھڑانا چاہیں تو ایسا کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ اور اگر تمہارا خیال اپنی اولاد کو کسی غیر عورت سے دودھ پلوانے کا ہو تو اس میں بھی کوئی حرج نہیں۔ بشرطیکہ اس کا کچھ معاوضہ طے کرو۔ اور معروف طریقے پر ادا کرو۔ اللہ سے ڈرو اور جان رکھو کہ جو کچھ تم کرتے ہو سب اللہ کی نظر میں ہے۔

اس مختصر جائزہ سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کریم نے بنیادی انسانی حقوق کا تصور جدید مغرب سے بہت پہلے دیا تھا۔ اور رسول اللہؐ نے خطبہ حجۃ الوداع میں ان بنیادی حقوق کی مزید وضاحت کردی تھی ۔

اسلام کا ایک امتیاز یہ بھی ہے کہ اس نے بنیادی انسانی حقوق کی حفاظت کے لئے قانون ہی نہیں بنایا بلکہ انسان کے اندر اسکے شعور اور اس کے ضمیر کو بیدار کر کے اور اس کے اندر خدا خوفی، خلق خدا سے محبت، احساس ذمہ داری اور آخرت میں جواب دہی کا احساس پیدا کر کے حقوق انسانی کی محافظت کی ضمانت فراہم کی۔ یہ وہ اسلامی امتیازات ہیں جن سے آج حقوق انسانی کا علمبردار مغرب بالکل محروم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تمام تر دعووں، اعلانات اور اعلامیوں کے باوجود حقوق انسانی کے علمبردار ہی سب سے زیادہ ان کی خلاف ورزی کر رہے ہیں، امریکہ آج دنیا میں ان حقوق کی سب سے زیادہ خلاف ورزی کرنے میں فخر محسوس کرتا ہے کیونکہ وہ بنیادی اخلاقیات واقدار سے عاری ہے۔

حوالے:

۱۔ القرآن کریم، سورہ البقرہ: ۲۳۱

۲۔نفس مصدر، المائدہ، ۲۸

۳۔نفس مصدر، المائدہ: ۳

۴۔نفس مصدر، سورہ الشوریٰ: ۱۳

۵۔نفس مصدر، سورہ البقرہ: ۸۳۔۸۴

۶۔نفس مصدر، سورہ المائدہ: ۳۲

۷۔بخاری، کتاب الحج، بحوالہ بنیادی حقوق، محمد صلاح الدین، مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی۔۱۹۸۹ ص ۳۲۳

۸۔قاضی محمد سلیمان منصور پوری، رحمت للعالمین، مطبوعہ شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور، جلد اول ص ۱۱۸

۹۔نعیم صدیقی، محسن انسانیت، مطبوعہ اسلام پبلیکیشنز لمیٹڈ لاہور ۱۹۷۲ ص ۲۲۴

۱۰۔طبرانی بحوالہ بنیادی حقوق حوالہ بالا ص ۲۴۴

۱۱۔ابوداؤد بحوالہ بنیادی حقوق حوالہ بالا ص ۲۵۱

۱۲۔مودودی سید ابوالاعلیٰ تفہیم القرآن، مرکزی مکتبہ اسلامی پبلیشرز جلد پنجم ص ۸۹

۱۳۔ترمذی، بحوالہ بنیادی حقوق، حوالہ بالا ص ۲۵۳

۱۴۔سید ہاروی، حفظ الرحمٰن، اسلام کا اقتصادی نظام، مطبوعہ ندوۃ المصنفین دہلی ۱۹۵۹ء ص ۹۲

۱۵۔نفس مصدر ص ۸۹

۱۶۔شبلی نعمانی، سیرۃ النبی مطبوعہ اعظم گڑھ جلد اول طبع سوم ص ۲۹۵

۱۷۔القرآن الحکیم، سورہ الحجرات: ۱۳

۱۸۔بخاری، بحوالہ بنیادی حقوق، حوالہ بالا۔ص ۲۷۷

۱۹۔القرآن الحکیم، سورہ الشوریٰ: ۱۵

۲۰۔بخاری حوالہ بنیادی حقوق، حوالہ بالا ص ۳۰۳

۲۱۔القرآن الحکیم سورۃ البقرہ: ۲۳۳

ڈاکٹر محمد تعظیم

خطبہ حجۃ الوداع:
اور انسانی حقوق

رسول خدا حضرت محمدؐ نے جب خالق کائنات کی وحی ''اقراء باسم ربک الذی خلق لہ'' اور نبوت کا مژدہ سنا تو آپ خالق کون ومکان کے دین کی اشاعت وتبلیغ میں اپنی بے سروسامانی کے ساتھ دامے، درمے، سخنے مصروف ہوگئے اور یہ مشن ایک ایسے معاشرہ میں انجام دینا تھا جس میں انسانیت، اخوت، ہمدردی، پیار ومحبت کا فقدان تھا۔ اور جس معاشرہ کی امتیازی شان کشت وخون، نفرت، عداوت کینہ، بغض وحسد، عائلی وقبائلی عصبیت، فتنہ پروری، شرانگیزی، جرأت وبہادری کا مظاہرہ ہوا کرتی تھی۔ جہاں لوگ توہم پرستی، بدعقیدگی وبدکاری میں ڈوبے ہوئے تھے۔ جہاں خواتین کو صرف ایک شئی سمجھا جاتا تھا۔ بیٹی کی پیدائش خاندان کے ماتھے پر کلنک تصور کی جاتی، اسی لئے بیٹیوں کو قتل کرنے اور زندہ درگور کرنے کا شیطانی رواج قبائل قریش وکندہ میں عام اور قابل فخر سمجھا جاتا تھا۔ محرمات سے نکاح کا عام دستور تھا۔ سب سے بڑا بیٹا اپنے باپ کے مرنے کے بعد اپنی سگی ماں کے سوا باقی تمام سوتیلی ماؤں کا مالک بن جاتا جو اس کے حق وراثت کا حصہ تھا۔ لہذا ایسے معاشرہ میں لوگوں کو صلح، اصلاح اور خدائے واحد کی پرستش پر آمادہ کرنا دشوار تو ضرور تھا مگر ناممکن نہ تھا۔ آپؐ نے اپنی ۲۳ سالہ محنت شاقہ سے یہ ثابت کردیا کہ کس طرح ایک پچھڑے ترین معاشرے کو صراط مستقیم پر گامزن کرکے ایک مثالی معاشرے میں تبدیل کیا جاسکتا ہے۔

سید امیر علی خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے رقم طراز ہیں '' آپ کی زندگی ایک

گرانقدر کام کو بہ نحو احسن انجام دینے کی بہترین سرگزشت ہے۔ آپ نے ایک مردہ وافسردہ قوم میں زندگی کی روح پھونک دی۔ آپ نے باہم برسرِ پرخاش قبیلوں کے مجموعہ متفرقات کو وحدت بخش کر ایک ایسی قوم بنادیا، جس کا محرک عمل حیات ابدی کی امید تھی۔ روشنی کی جو منتشر شعاعیں اس وقت علیحدہ علیحدہ دل انسانی پر پڑی تھیں۔ انھیں لے کر آپ نے ایک نقطہ پر مرکوز کردیا۔ یہ تھا آپ کا کارنامہ اور آپ نے اسے ایک ایسے ذوق وشوق اور جوش وخروش سے انجام دیا جو مخالف قوتوں سے کسی قسم کی مصالحت قبول نہ کرتا تھا۔ اور جس کے لئے کسی ایک مقام پر پہنچ کر ساکن ہوجانا بعید از تصور تھا، ایک ایسی ہمت مردانہ سے انجام دیا جو کسی قسم کی رکاوٹ کو خاطر میں نہ لاتی تھی اور جو خوف نتائج سے بالکل بری تھی۔ ایک ایسی وحدت کے مقصد سے انجام دیا جس میں اپنی ذات کے خیال کی کوئی گنجائش نہ تھی۔ ؎

خالق کائنات کی طرف سے اس اعلان ''اذا جاء نصر اللہ والفتح ورأیت الناس یدخلون فی دین اللہ افواجا فسبح بحمد ربک واستغفرہ انہ کان توابا۔'' (ترجمہ) جب خدا کی مدد آگئی اور مکہ فتح ہوچکا اور تم نے دیکھ لیا کہ لوگ خدا کے دین میں فوج کی فوج داخل ہورہے ہیں تو خدا کے حمد کی تسبیح پڑھو اور استغفار کرو۔ خدا توبہ قبول کرنے والا ہے ؎ کے بعد اگر ایک طرف رسولؐ خدا کو یہ احساس ہوگیا تھا کہ نبوت کا مشن پایہ تکمیل کو ہوپہنچ گیا ہے تو دوسری طرف آپؐ کے صحابہ کی ایک جماعت کو بھی اس بات کا احساس ہوگیا تھا کہ رسول اللہ خدائے مطلق کا ابدی پیغام پہنچا چکے اور اب وہ ہمارے درمیان زیادہ عرصہ نہ رہ سکیں گے۔ لہٰذا آپ نے اپنا آخری حج کرنے کا ارادہ کیا۔ اس خبر کے بعد مسلمانوں کی ایک تعداد کثیر حج بیت اللہ کے ارادے سے روانہ ہوئی تاکہ وہ رسولؐ خدا کے ہمراہ حج کی سعادت حاصل کرسکے۔ آپؐ مدینہ سے روانہ ہوکر نو دن کی مسافت کے بعد ۴ ذی الحجہ ۱۰ھ کو اپنے خاندان ورفقا کے ساتھ مکہ مکرمہ پہنچے۔ خانہ کعبہ کو دیکھ کر فرمایا ''اے خدا! اس گھر کو اور زیادہ عزت وشرف دے۔'' طواف کعبہ کے بعد صفا ومروہ پر حاضر ہوئے۔

۸ ذی الحجہ ۱۰ھ کو منیٰ میں قیام کیا۔ اگلے روز ۹ ذی الحجہ ۱۰ھ کو میدان عرفات میں پہنچے اور یہیں پہ ناقہ پہ سوار آپؐ نے وہ تاریخی خطبہ ارشاد فرمایا جو حقوق البشر کا عالمی و آفاقی منشور ہے۔ خطبہ حجۃ الوداع۔ وحدت الٰہی اور وحدت آدمؑ کا ایسا آفاقی اعلان نامہ ہے جسے انسانی تہذیب کے روحانی، ودانشورانہ تخلیقی سفر کی منزل مراد کہا جا سکتا ہے۔ یہ اعلان اس ازلی و ابدی انسانی موقف کی حتمی دستاویز ہے کہ تمام انسان اپنی اصل کے اعتبار سے ایک ہیں۔ ان کا خالق ایک ہے اور مورث اعلیٰ ایک ہے۔ اور سب انسانوں کی تخلیقی ساخت ایک ہے یعنی مٹی۔ یہ اعلان ایک ایسی تلوار ہے جس نے انسانوں کے دل ودماغ اور نفس کے گرد لپٹی رنگ ونسل، ذات برادری، خاندان اور طبقوں کی زنجیریں کاٹ کر رکھ دی اور انسانی روح کو اس کے بے پناہ تخلیقی امکانات سے آشنا کیا۔ اور اس کی فطری صلاحیتوں کو پھلنے پھولنے کا ایسا وسیع میدان عطا کیا جہاں پہ ہر چیز کا معیار صرف انسانی عمل ہے ایسا انسانی عمل جو تقویٰ اور پرہیزگاری سے عبارت ہے۔"

مختلف روایات کو جمع کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے حجۃ الوداع میں دو خطبے، ۹ اور ۱۰ ذی الحجہ ۱۰ھ کو عرفات اور منیٰ کے میدان میں دیئے تھے۔ جنہیں عام طور پہ خطبہ حجۃ الوداع کے نام سے یاد کیا جاتا ہے یہ خطبہ بلاغت نبویؐ کے اعلیٰ نمونہ کے حامل ہونے کے علاوہ اسلامی قانون واخلاق کا بھی جامع ہے۔ جو تکمیل نبوتؐ کے اعلان کے ساتھ ساتھ اخوت ومساوات، حریت، عفو ودرگذر استحصال کے خلاف آواز، صحت مند معاشرہ کی تعمیر، حقوق نسواں، ہمدردی، حق وراثت، امن وامان اور حقوق العباد کا ایک بین الاقوامی منشور بھی ہے۔ اس خطبہ میں رسول پاکؐ نے حقوق انسانی کے اصولوں کا واضح اعلان کر دیا تھا، فقہاء اسلام نے ان اصولوں کو حسب ذیل قانونی دفعات میں مرتب کر کے پیش کیا ہے۔

۱۔ نسل انسانی کا تحفظ، روٹی کپڑا اور مکان کا حق۔

۲۔ انسانی جان کا احترام، بلالحاظ عقیدہ ومذہب ہر جان کی حفاظت کا حق۔

۳۔ انسانی مال واملاک کی حفاظت کا حق معاشی واقتصادی ترقی کرنے کے یکساں مواقع اور ذرائع کا انتظام۔

۴۔عقیدہ ومذہب کی آزادی، مذہبی پیشواؤں کا احترام۔

۵۔سماجی مساوات وآزادی، مرد اورعورت کے درمیان آقائی اور غلامی کے عام تصور کی تردید۔ ۵

اس وقت اسلام اپنی تمام شان وشوکت کے ساتھ جلوہ افروز تھا۔ اور ایام جاہلیت کے تمام لغو و بے ہودہ رسم ورواج کو مٹادیا گیا تھا۔ حضور اکرمؐ نے تکمیل نبوت کا اعلان کرتے ہوئے فرمایا:

''لوگو! میری بات غور سے سنو! میرا خیال ہے کہ شاید اس سال کے بعد میں اس جگہ تم سے نہ مل سکوں گا اور اس سال کے بعد حج نہ کرسکوں''

ہر دور میں عصبیت وتنگ نظری سے لوگوں کو مختلف طبقات ونسلوں میں تقسیم کردیا جاتا تھا۔ جس کو سابقہ مذاہب بھی ختم کرنے میں ناکام رہے تھے سلاطین وامراء کی برابری کرنے کی ہمت عام آدمی میں نہ تھی شرفاء اپنے کو بالاتر مخلوق تصور کرتے تھے۔ علماء عام آدمی کو منہ لگانے کو تیار نہ تھے۔ غلام انسانی سماج میں ایک حقیر کیڑے سے زیادہ اہمیت کے حامل نہ تھے مگر آپ نے یک قلم مختلف رنگ ونسل کے انسانوں کو آپس میں بھائی بنادیا۔ اور مساوات کا عالمی سبق دیتے ہوئے انسانی سماج کے امتیازات کی تمام حد بندیوں کو توڑ دیا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

''اے لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا ہے اور تمہارے بہت سے خاندان اور قبیلے بنادیئے تاکہ تم پہچانے جاسکو خدا کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو تم میں سب سے زیادہ پرہیزگار ہے۔'' ۶

لہٰذا آپؐ نے اعلان کردیا:

''پس اب نہ کسی عربی کو کسی عجمی پر فضیلت حاصل ہے اور نہ کسی عجمی کو کسی عربی پر۔

نہ کالا گورے سے افضل ہے اور نہ گورا کالے سے فضیلت وبرتری کا انحصار صرف تقویٰ پر ہے۔سب لوگ آدمؑ کی اولاد ہیں اور آدمؑ مٹی سے پیدا کیئے گئے ہیں۔خبر دار! اب فضیلت کا ہر دعویٰ اور اس کی بنیاد پر خون ومال کے سارے مطالبے وانتظام میرے پاؤں تلے روندے جاچکے ہیں۔پس بیت اللہ کی تولیت اور حاجیوں کی خدمت اپنے سابقہ حال پر باقی رہیں گی۔ اے قریش کے لوگو! ایسا نہ ہو کہ تم خدا کے حضور میں اس طرح آؤ کہ تمہاری گردنوں پر دنیا کا بوجھ لدا ہو۔ اور لوگ سامان آخرت لے کر آئیں۔ اس صورت میں خدا کے سامنے میں کچھ بھی تمہارے کام نہ آسکوں گا۔''

عرب معاشرے میں قتل وغارت گری شان امتیاز تھی۔ اگر کسی عرب کے ہاتھوں کسی کا قتل ہوجاتا تو اس کا انتقام لینا اس کے قبیلے وخاندان کا فرض اولین تھا۔ چاہے انتقام لینے میں سیکڑوں برس کا عرصہ ہی کیوں نہ لگ جائے۔ اور اس عرصے میں فریقین کے مابین خون کی ندیاں بہنے کا سلسلہ جاری رہے۔ جو عربی عصبیت وحمیت کا پرفخر مشغلہ تھا۔ اس طرح کا انتقامی جذبہ اور عصبیت صرف عرب معاشرہ میں ہی نہ تھی بلکہ دنیا کی دیگر اقوام بھی اس مرض میں مبتلا تھیں۔ تو کیوں کر انسانی معاشرہ ترقی کی جانب گامزن رہ سکتا تھا۔ اور ترقی کے لئے امن واماں کا دور دورہ ضروری تھا۔ تو پھر محسن انسانیتؐ اس قبیح رسم کو ختم کرنے کی بات کیوں نہ کرتے۔ لہٰذا آپؐ نے اعلان کیا:

''خبر دار! زمانہ جاہلیت کی تمام رسمیں میرے پاؤں تلے روندی گئیں۔ زمانہ جاہلیت کے خون کے سارے انتقام اب کالعدم ہیں۔ سب سے پہلے اپنے ہی خاندان کا خون جو ربیعہ بن الحارث کے دودھ پیتے بیٹے کا ہے معاف کرتا ہوں۔''

ربیعہ بن الحارث رسولؐ خدا کے چچازاد بھائی تھے۔ مکہ کے دستور کے مطابق دودھ پلانے کے لیئے ان کے بیٹے آدمؑ بن ربیعہ کو قبیلہ بنو سعد کے سپرد کیا گیا تھا۔ ننھا منا آدمؑ بن ربیعہ ایک دن گھر کے سامنے بیٹھا تھا کہ بنی ہذیل کے ایک آدمی نے پتھر مارا جس کی چوٹ

سے آدمؑ بن ربیعہ وہیں جان بحق ہوگیا۔ جس کے خون کا بدلہ لیما خاندان پر ادھار چلا آتا تھا۔ جس کو محسن انسانیت نے اس مبارک تقریب میں معاف فرمایا تھا۔ تاکہ صحت مند معاشرہ کی تشکیل کے لئے امن وامان کا قیام ممکن ہوسکے اور انسان کا احترام کیا جاسکے۔

اس زمانے میں عرب دنیا اور دیگر ممالک میں بھی سودی کاروبار کا رواج تھا۔ سود در سود کے حصول کی خاطر سرمایہ دار غرباء کا ریشہ ریشہ جکڑ لیتے تھے۔ جس کے باعث مقروض قرض خواہوں کے غلام بن جاتے۔ اور پھر استحصال کا ایک نیا دور دورہ شروع ہوجاتا جس سے آزادی کبھی ممکن ہی نہ تھی۔ لہذا محسن انسانیتؐ نے انسانی سماج کی اس سب سے بڑی لعنت کو ختم کرنے کا علان کیا فرمایا۔

''نہ ظلم کرو نہ ظلم سہو، اللہ نے حکم دیا ہے سود نہ رہنے پائے۔ لہذا دور جاہلیت کا سود اب ختم کیا جاتا ہے۔ اور میں سب سے پہلے اپنے چچا عباس بن عبدالمطلب کا سود معاف کرتا ہوں اور اب یہ کالعدم ہے۔''

رسولؐ خدا نے ان بدترین رواج کو ختم کرنے کے لئے سب سے پہلے اپنے آپ اور اپنے خاندان کو مثال بنا کر پیش کیا تاکہ لوگ اتباع کریں اور مثالی معاشرہ کی تعمیر میں معاون بن سکیں۔ آپ مزید وضاحت کرتے ہوئے لوگوں سے مخطب ہوئے:

قریش کے لوگو! اللہ نے تمہاری جھوٹی نخوت کو ختم کرڈالا۔ اور باپ دادا کے کارناموں پر تمہارے فخر ومباہات کی اب کوئی گنجائش نہیں لوگو! تمہارے خون، تمہارے اموال اور تمہاری عزت وآبرو کی حرمت اسی طرح تم پر واجب ہے جس طرح تمہارے لئے اس دن، اس مہینے اور اس شہر کی حرمت واجب ہے۔ اور عنقریب تم اپنے پروردگار سے جاملو گے۔ اور تم اپنے اعمال کے جوابدہ ہوگے۔''

ظاہر ہے خاندانی عزت ومرتبہ اب تقویٰ کا معیار نہ تھا بلکہ اعمال تقویٰ کے معیار تھے۔ رسول خداؐ نے کہا:

''قتل عمد میں قصاص لیا جائے گا۔ قتل خطا وہ ہے کہ جب کسی کو لاٹھی یا پتھر مارنے سے قتل کیا جائے اور اس میں سو اونٹ (بطور خون بہا) ہیں جو اس سے زیادہ مانگے تو وہ زمانہ جاہلیت والوں میں سے ہوگا''

عربوں کے لحاظ سے جن کی دولت اونٹ تھی یہ کافی سخت سزا تھی ۔پیغمبر ؐ خدا نے ایک نیا نظام سیاست ترتیب دیا اور اس بات کی وضاحت کردی کہ جرم کی سزا صرف مجرم کو ہی ملے گی۔ اس کے لواحقین یا افراد خانہ اس کی سزا کے مستحق نہیں ہوں گے۔ بلکہ ہر شخص اپنے اعمال کا خود ذمہ دار ہوگا۔ اورسزا کا حقدار صرف مجرم ہی ہوگا نہ کہ اس کے اعزاء واقارب ۔ آپ ؐ نے واضح طور پر اس کا اعلان کیا اور کہا۔

''جان لو! مجرم خود اپنے جرم کا ذمہ دار ہے۔ اب نہ باپ کے بدلے بیٹا پکڑا جائے گا اور نہ بیٹے کا بدلہ باپ سے لیا جائے گا کسی شخص کے لئے اپنے کسی بھائی کی چیز لینا جائز نہیں ۔ جب تک کہ وہ اپنی خوشی سے نہ دے۔بس تم ایک دوسرے پر ظلم وزیادتی نہ کرو۔''

آپ ؐ نے حقوق العباد کی اہمیت کو مزید اجاگر کرتے ہوئے فرمایا:

''قرض ادا کیا جائے گا۔ امانتاً لی ہوئی چیز واپس کی جائے گی ۔تحائف کا لین دین ہوگا اورضامن تاوان کا ذمہ دار ہوگا''

اسلام کے آغاز سے قبل دنیا میں عورتوں کی کوئی اہمیت نہ تھی ۔ ان کو دیوی بنا کر توپوجا جاتا تھا مگر عام زندگی میں ان کے استحصال کا کوئی موقع نہیں گنوایا جاتا تھا ۔ ان کی وقعت ایک کھلونے سے زیادہ نہ تھی۔ انھیں سامان تعیش سمجھا جاتا تھا ۔ اور ان کی حیثیت ملک وجائیداد سے زیادہ نہ تھی۔عرب دنیا میں باپ کے مرنے کے بعد اس کی تمام بیویوں کا حقدار ماں کو چھوڑ کر بڑا بیٹا بن جاتا تھا۔جنسی بے راہ روی عام تھی۔عورتوں کو کسی قسم کے حقوق حاصل نہ تھے ۔اور نہ سماج میں کوئی مقام میسر تھا۔لہذا آپ نے اعلان کیا:

'اے لوگو! تمہاری عورتوں پر تمہارے کچھ حقوق ہیں اور اسی طرح تم پر بھی ان کے

کچھ حقوق واجب ہیں۔ ان پر تمہارا یہ حق ہے کہ وہ تمہارے بستر پر کسی ایسے شخص کو نہ بیٹھنے دیں۔ (بدکاری کے لئے) جس کو تم ناپسند کرتے ہو۔ اور تمہارے گھروں میں کسی ایسے شخص کو داخل نہ ہونے دیں جس کو تم پسند نہ کرتے ہو'' بجز تمہاری اجازت کے ۔ اور ان پر تمہارا یہ بھی حق ہے کہ وہ تمہارے حقوق کی حفاظت کریں کوئی خیانت نہ کریں اور بے حیائی کا کوئی کام نہ کریں۔ اگر وہ ایسا کریں تو تمہارے رب نے اس کی اجازت دی ہے کہ تم ان کو اپنی خوابگاہوں سے علیحدہ کردو (اور اس پر بھی باز نہ آئیں تو) ان کو معمولی جسمانی سزا دو۔ اگر وہ باز آجائیں تو ان کو حسب دستور کھلاؤ، پہناؤ۔''

''خبردار! کسی عورت کے لئے یہ جائز نہیں کہ اپنے شوہر کے مال میں سے اس کی اجازت کے بغیر کسی کو کچھ دے۔ عورتوں کے ساتھ بہتر سلوک کرو کیونکہ وہ تمہاری نگرانی میں ہیں۔ اور وہ اپنے لئے خود کچھ نہیں کرسکتیں۔ عورتوں کے معاملے میں اللہ سے ڈرو۔ تم نے انکو اللہ کی امانت کے طور پر حاصل کیا ہے اور کلمات الٰہی کے ذریعہ سے انھیں اپنے لئے جائز اور حلال کیا ہے۔''

بچہ اس کی طرف منسوب کیا جائے گا جس کے بستر پر وہ پیدا ہوا۔ جس نے حرام کاری کی اس کی سزا سنگساری ہے اور اس کا حساب خدا کے ذمہ ہے۔ اور جو کوئی اپنا نسب بدلے گا یا اپنے مالک کے بجائے کسی اور کو اپنا مالک ظاہر کرے گا اس پر خدا کی لعنت ہے۔''

اس طرح آپؐ نے ایک صالح معاشرہ کی تعمیر کردی اور لوگوں کو زنا کاری وعیاشی سے خبردار کردیا۔ کیونکہ یہ اعمال صالح معاشرہ کی تعمیر میں زبردست رکاوٹ پیدا کرتے ہیں۔ اسی لئے اسلام نے زانی کو رجم کرنے کی سخت سزا کی بات کی۔ موجودہ دور میں بڑھتے جنسی جرائم وجنسی آزادی کو دیکھتے زانی کے لئے پھانسی کی سخت ترین سزا کی وکالت کی جارہی ہے کیونکہ عدالت میں قانونی موشگافیوں کے سبب زانی عام طور پر سزا سے بچ جاتے ہیں اور موجودہ قوانین کی لچک کا فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور پھر جنسی بے راہ روی کی وجہ

سے نطفہ کی صداقت کو لے کر جھگڑے پیدا ہوتے ہیں۔ اور جدید سائنس کے ذریعہ ثابت کیا جاتا ہے کہ نطفہ کس کا ہے۔ لیکن اسلام نے اسی لئے ان معاملات میں واضح ہدایات جاری کردیں تھی۔ آج کل معاشرہ طلاق کی لعنت میں مبتلا ہے مگر یہاں پر آپؐ نے علیحدگی کے واضح اسباب بیان کر کے اس لعنت سے بچنے کی ایک طرح تلقین فرمادی۔ اور حتیٰ الامکان صلح و صفائی کی گنجائش کی وضاحت کردی۔ تاکہ خانگی زندگی کے انتشار کو روک کر صالح معاشرہ کی تشکیل و تعمیر ممکن ہو۔ ساتھ ہی آپ نے سماج کے ایک اور جھگڑے وراثت کی نشاندہی کرتے ہوئے اس کا حل بتادیا۔ کیونکہ معاشرہ میں ایک برائی وراثت سے متعلق جنگ بھی ہے ترکہ وجائیداد کو لے کر خاندان کے خاندان یہاں تک کہ مملکتیں تک تباہ برباد ہو گئیں۔ یہی نہیں بلکہ اس کو لیکر کشت وخون کا بازار گرم ہوجاتا ہے لہذا آپؐ نے واضح الفاظ میں میراث کے قانون کی وضاحت کرتے ہوئے وصیت کو ممنوع قرار دیا۔ آپؐ نے فرمایا:

"اے لوگو! بے شک اللہ تعالےٰ نے ہر وارث کے لئے (مرنے والے کی) میراث میں اس کا حصہ مقرر کردیا ہے اور کسی کو وارث کے لئے (مزید) وصیت جائز نہیں ہے اور وصیت (ترکے کے) ایک تہائی سے زیادہ کے لئے درست نہیں۔"

اس زمانے میں غلامی کا دستور عام تھا۔ اور ان پر ظلم و استحصال کی کہانی طویل تھی۔ قدیم آئین (Ancient Law) کا مصنف ماکئے Maine کہتا ہے "کسی اور کی جسمانی طاقت کو اپنے آرام و آسائش یا راحت و مسرت کے لئے استعمال کرنے کی خواہش ہی بلاشک وشبہ غلامی کی بنیاد ہے اور یہ خواہش اتنی ہی قدیم ہے جتنی فطرت انسانی۔" یے غلامی کا رواج انسانی تاریخ کا ہی ہم عمر ہے۔ جس کے آثار ہر دور اور ہر قوم میں پائے جاتے ہیں۔ اس کی ابتدا اس وقت سے ہوگئی تھی جب انسانی معاشرہ وحشت کے مرحلے میں ہی تھا اور یہ دستور اس وقت بھی فروغ پاتا رہا جب مادی ترقی وتہذیب نے اس کی ضرورت کو رفع کردیا تھا۔ بیسویں صدی تک یہ رواج بدستور قائم رہا اور آج بھی کہیں نہ کہیں اس کی جڑیں انسانی سماج میں

موجود ہیں۔ اسلامی تعلیمات اور رسولؐ خدا اور ان کے صحابہؓ کے طریق کار نے غلامی کے رواج پر ایک شدید ضرب لگائی تھی مگر ہمسایہ قوموں میں اس کی جڑیں بہت گہری تھیں اور انسانی فطرت میں بڑی کج روی پائی جاتی ہے اس لئے اسلام اس نظام کو ختم کرنے سے قاصر رہا لیکن غلاموں کے سلسلے میں سخت ضابطہ بنا کر اس رواج کو کم سے کم کرنے کی شعوری کوشش انسانی تاریخ میں صرف اسلام نے ہی کی۔ پھر یہ کیسے ممکن تھا کہ حجۃ الوداع کے موقع پر محسنؐ انسانیت اس سلسلے میں مزید وضاحت نہ کرتے۔ آپ نے فرمایا۔

"لوگو! ہر مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے اور تمام مسلمان باہم بھائی ہیں۔ اپنے غلاموں کا خیال رکھو ہاں اپنے غلاموں کا خیال رکھو۔ ہاں اپنے غلاموں کا خیال رکھو۔ تمہارے غلام (نوکر) تمہارے خدمتگار ہیں تم ان کو وہی کھلاؤ جو تم خود کھاتے ہو۔ اور وہی پہناؤ جو تم خود پہنتے ہو۔"

اندازہ کیجئے کہ اس تعلیم کی روشنی میں غلام کا درجہ سماج میں کسی قدر بلند کرنے کی کوشش رسولؐ اللہ نے کی تھی۔ پروفیسر (Snouck Hurgronje) کو "اعتراف کرنا پڑا کہ محمدؐ کے اصول کے مطابق غلامی ایک ایسا ادارہ ہے جس کا ختم ہونا مقدر ہو چکا۔ ۸ کیونکہ اسلام دنیا میں امن وسلامتی، اخوت ومساوات کا پیغام لے کر آیا تھا۔ ادنیٰ واعلیٰ، آقا وغلام، گورا یا کالا، عرب یا غیر عرب خدا کے نزدیک تقویٰ کی بنیاد پر افضل ہے۔ رنگ ونسل یا علاقہ کی بنیاد پر نہیں۔ اسلام سے قبل عربوں کا نسلی تفخر اور خودسری ہی ان کی بدنظمی کا ایک بڑا سبب تھا۔ ہر شخص اپنی جگہ بزعم خود اپنے کو سردار سمجھتا تھا۔ اور دوسرے کی ماتحتی اور فرمانبرداری اس کے لئے باعث توہین تھی۔ اس وجہ سے ان میں اتحاد کا قائم ہونا مشکل امر تھا۔ لہذا ان کی شیرازہ بندی ضروری تھی اور اسلام نے یہ کام بخوبی انجام دیا تھا۔ رسولؐ خدا نے اپنے اس تاریخی خطبہ میں اس امر کی مزید وضاحت کرتے ہوئے کہا:

اگر کوئی ٹکٹا، سیاہ فام حبشی ہی تمہارا امیر بنادیا جائے اور وہ کتاب اللہ کے احکام کے

مطابق تمہاری قیادت کرے تو تم اس کی بات سنو اور اس کی اطاعت کرو۔''

اسلام سے قبل بہت سے مذاہب پیدا ہوئے مگر صاحب شریعت کے بعد ان کے پیروؤں نے ان مذاہب کی حقیقت اور تعلیمات کو گم کردیا۔ نتیجتاً اس وقت تک تمام مذاہب اپنی اصلی حقیقت وشناخت کھو چکے تھے۔ لہذا پیغمبر آخر الزماںؐ نے اس ابدی مذہب کا ہدایت نامہ (قرآن کریم) اپنی امت کے حوالے کرتے ہوئے یہ بھی وضاحت کردی کہ بنی نوع انسان کو ہدایت دینے کے لئے اب کوئی اور نبی نہ آئے گا۔ اور وہ اس سلسلے کی آخری کڑی ہیں جس کی ابتداء آدمؑ سے ہوئی تھی۔ رسولؐ خدا نے اعلان کیا:

'اے لوگو! میرے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا اور تمہارے بعد کوئی نئی امت پیدا نہ ہوگی۔ میں تمہارے درمیان ایسی چیز چھوڑے جاتا ہوں کہ اگر تم اسے مضبوطی سے تھامے رہے تو کبھی گمراہ نہ ہوگے۔ اور وہ ہے کتاب اللہ (قرآن کریم)'' اے لوگو! مذہب میں غلو اور مبالغے سے بچو۔ کیونکہ تم سے پہلے بہت سی قومیں مذہب میں غلو اختیار کرنے کی وجہ سے برباد ہوئی ہیں۔''

انسانی تاریخ میں قوموں کی بربادی کا ایک اہم سبب ان کے باہمی نفاق وخانہ جنگی رہے ہیں۔ جس نے ان کو تاریخ کے حاشیہ پر پہنچا دیا۔ لہٰذا اس لازوال امت کے بانی کو متحدہ قومیت کے دوام کی فکر دامن گیر تھی۔ اس لئے آپ نے لوگوں کو خبردار کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

خبردار! ''میرے بعد گمراہ نہ ہوجانا کہ آپس میں ایک دوسرے کی گردنیں مارنے لگو''

ساتھ ہی صحت مند سماج کی تلقین کرتے ہوئے کہا۔

''جس کے پاس امانت ہو تو اس پر لازم ہے کہ وہ امانت والے کو ٹھیک ٹھیک امانت ادا کرے۔''

ایک ماہر نفسیات وحکیم کی مانند انسانی فطرت کی سیمابی کو سامنے رکھتے ہوئے

مسلمانوں کو خبردار کیا اور مذہبی امور کا اعادہ کراتے ہوئے کہا:

''اے لوگو! شیطان اس بات سے مایوس ہو چکا ہے کہ اس شہر میں اب کبھی اس کی عبادت ہوگی۔

لیکن اسی بات کا امکان ہے کہ ایسے اعمال میں جن کو تم کم اہم سمجھتے ہو اس کی بات مان لی جائے گی۔ اس پر بھی وہ خوش رہے گا۔ تم اس سے اپنے دین کو بچا کر رکھنا'' پس اپنے رب کی عبادت کرو۔ پانچ وقت کی نماز ادا کرو اور ماہ رمضان کے روزے رکھو۔ اپنے مال کی زکوٰۃ خوشدلی کے ساتھ ادا کرتے رہو۔ بیت اللہ کا حج ادا کرو۔ اپنے امیر کے حکم پر چلو تم اپنے رب کی جنت میں داخل ہو جاؤ گے۔'' آپؐ نے لوگوں کو مزید وضاحت و تلقین کرتے ہوئے حرمت کا پھر احساس دلایا۔

''اے لوگو! نسیٔ (قمری سال کو شمسی سال کے برابر کرنے کے لئے اس میں وقتاً فوقتاً مہینوں کا اضافہ کرنا) تو بس کفر میں ایک اضافہ ہے۔ اس کے ذریعہ کفار گمراہی میں پڑتے ہیں کسی سال وہ اسے حلال ٹھہراتے ہیں اور کسی سال اس کو حرام کر لیتے ہیں تاکہ اللہ کے حرام کیے ہوئے (مہینوں) کی تعداد پوری کر لیں لیکن اب زمانہ اپنی ابتدائی حالت پر لوٹ آیا ہے۔ جس دن خدا نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا تھا۔ اللہ کے سال کے بارہ مہینے ہوتے ہیں۔ جن میں چار مہینے حرمت والے ہیں۔ تین مہینے مسلسل ہیں۔ (ذیقعدہ، ذی الحجہ اور محرم) اور ایک ماہ رجب ہے جو جمادی الثانی اور شعبان کے درمیان پڑتا ہے۔''

اس کے بعد آپؐ نے ختم نبوت کے اعلان کے ساتھ ساتھ حفاظت دین کی تلقین ہی نہیں بلکہ اشاعت دین کی ضرورت و افادیت کی طرف بھی اشارہ کیا تاکہ اس الہامی مذہب کی حفاظت بطریق احسن ہو سکے۔ آپؐ نے فرمایا:

''سنو! جو لوگ یہاں موجود ہیں وہ میری بات ان لوگوں تک پہنچا دیں جو یہاں موجود نہیں کیونکہ بہت سے ایسے لوگ جن کو میرا پیغام پہنچے گا وہ ان لوگوں سے زیادہ اسے محفوظ

رکھنے والے ہوں جو اس وقت سننے والے ہیں۔"

پھر آپؐ نے مجمع کو مخاطب کر کے تکمیل دین کی شہادت حاصل کی۔ کیونکہ آپ پر فرض نبوت کے مکمل ہونے کی وحی الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی ورضیت لکم الاسلام دینا۔" (ترجمہ) آج میں نے تمہارے لئے دین کو مکمل کر دیا اور اپنی نعمت تمام کر دی۔ اور تمہارے لئے مذہب اسلام کو انتخاب کر لیا)۹ کے نزول کے ساتھ فرمان رسولؐ پر خالق کونین نے بھی اپنی مہر ثبت کر دی۔ آپ نے فرمایا:

" اے لوگو! جب میرے بارے میں سوال کیا جائے گا تو تم کیا جواب دو گے!

حاضرین نے (ایک زبان ہو کر) جواب دیا ہم شہادت دیتے ہیں کہ آپ نے امانت کو پوری طرح ادا کیا۔ اللہ کا پیغام ہم تک پہنچا دیا۔ اور ہماری خیر خواہی فرمائی" پھر رسولؐ خدا نے اپنی شہادت کی انگلی آسمان کی طرف اٹھائی اور فرمایا۔" اے اللہ تو گواہ رہ۔ اے اللہ تو گواہ رہ۔ اے اللہ تو گواہ رہ۔" اور اس طرح محسنؐ انسانیت نے اس آفاقی پیغام کو جو احکام خدا کی بجا آوری اور اس کی وحدانیت کے اقرار، نسلی وعلاقائی عصبیت کی مخالفت، حقوق نسواں اتحاد واتفاق، آنے والی نسلوں کو اس دعوت کو عام کرنے کی تلقین۔ ختم نبوت کا اعلان، انسانی خون کا احترام صراط مستقیم پر چلنے کی تلقین اور مسلمانوں پر اس پیغمبرانہ مشن کو ایک دوسرے تک بلا تفریق رنگ ونسل وجنس پہنچانے کی ذمہ داری کے احساس پر مشتمل تھا، پہنچا دیا رسولؐ خدا کو احساس تھا کہ جلد ہی یہ پیغام بلاد عرب سے نکل کر پوری دنیا کو اپنی طرف بلا لے گا، محسنؐ انسانیت نے اپنے ان ارشادات کے ذریعہ جو کچھ پیش فرما دیا انسانی ذہن کی رسائی اس سے آگے محال نظر آتی ہے۔ دنیا کی تمام تر برائیوں کی بنیاد زر زمین اور زن کو قرار دیا گیا ہے۔ اور آپؐ نے ان کے سلسلے میں مبنی بر انصاف تشریحات پیش کر دی تھیں۔ تا کہ خلق خدا ان مادی ضروریات کو بطریق احسن حاصل کر سکے۔ مشہور فلاسفر برٹرینڈ رسل (Bertrand Russell) سرورکائناتؐ اور مذہب اسلام کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے لکھتا ہے۔" میں نے دین محمدؐ

کو ایک زندہ مذہب ہونے کی امتیازی خصوصیت کی بنا پر ہمیشہ احترام کی نگاہ سے دیکھا ہے۔ اسلام تنہا مذہب ہے جس میں گوناگوں حالات، بدلتے ہوئے اطوار اور زندگی کی تغیر پذیر صورتوں سے مطابقت اور ان پر اثر انداز ہونے کی صلاحیت پائی جاتی ہے۔ اس بنیاد پر میں پیش گوئی کرتا ہوں، اور اس کے آثار ابھی سے ظاہر ہیں کہ مستقبل میں یوروپ کا مذہب محمدؐ کا پیش کردہ دین ہوگا... میرا عقیدہ ہے کہ اگر موجودہ دنیا کے معاملات کی زمام کار ان (محمدؐ) جیسے انسانوں کے ہاتھ میں ہوتو وہ انسانیت کو درپیش مسائل ومشکلات کا ایسا حل پیش کریں گے کہ دنیا امن وامان اور صلح وآشتی کا گہوارہ بن جائے۔[۱۰]

تصویر کا ایک رخ تو یہ تھا کہ آج سے چودہ سو سال سے بھی زائد عرصہ قبل تمدن نا آشنا معاشرہ کو انسانیت کا مکمل درس مل گیا تھا اور تصویر کا دوسرا رخ یہ تھا کہ سائنس اور ٹکنالوجی کی ترقی کے سبب مادی وسائل کی ترقی، بڑھتی مادیت، فلاح وبہبود کے بجائے انسان کا انسان کے ذریعہ استحصال، فطری انسانی جبلت کہ دنیا اس کی غلام ہو، حکومت کرنے کے اس کے عزائم جس کے نتیجے میں تخریب کاری اور تباہ کن ہتھیاروں کی ایجادات، جس کے سبب بیسویں صدی میں دنیا دو عظیم جنگوں کے بعد کی تباہی وبربادی، انسانی جانوں کے اتلاف اور انسانیت پر ماتم کناں تھی۔ اور مفکرین وسیاست داں حقوق البشر کا اقوام متحدہ کی جانب سے ایک بین الاقوامی منشور تیار کررہے تھے جس کا اعلان ۱۰ ر دسمبر ۱۹۴۸ء کو کیا گیا[۱۱] جو اعلانیہ چودہ سو سال قبل کے اعلانیہ سے کسی طور پر افضل نہ تھا۔ اقوام متحدہ کے اس منشور کی دفعات ۱، ۲، ۳، ۴، ۵، ۶، ۷ وغیرہ کے ذریعہ تمام انسانوں کو اخوت وبرابری کے حقوق کا درجہ بلا امتیاز نسل، رنگ جنس زبان قومیت یا جائے پیدائش کے دیا گیا اور قانون کی نظر میں سب کو برابر متصور سمجھا گیا۔ جبکہ اس کا علان تو رسول اکرمؐ نے چودہ سو سال قبل ہی کر دیا تھا۔ آپؐ نے واضح انداز میں تقویٰ کو معیار فضیلت قرار دیا تھا۔ اقوام متحدہ کے اس منشور کی دفعہ ۱۶ کے تحت ہر بالغ مرد وعورت کو بلا امتیاز نسل، قوم مذہب اپنی مرضی سے شادی کا اختیار دیا گیا اور

ازدواجی زندگی وطلاق کے مساویانہ حقوق حاصل ہوئے۔ مگر رسولؐ خدا نے تو خواتین کے ساتھ بہتر اور مساویانہ سلوک کرنے اور مساوی حق وراثت دینے کا اعلان وحکم امت مسلمہ کو چودہ سو سال پہلے ہی دے دیا تھا۔ اس بین الاقوامی منشور کی دفعہ ۱۱ کے ذریعہ عدالت میں کسی فرد پر جرم کے ثابت ہونے پر سزا کا حقدار قرار دیا۔ جس کو حجۃ الوداع کے موقع پر محسنؐ انسانیت نے اپنے جرم کے ذمہ دار مجرم کو پہلے ہی سزا کا حقدار قرار دے دیا تھا۔ اس اقوام متحدہ کے منشور کی دفعہ ۵، ۱۰، ۱۲ کے ذریعہ ظلم وزیادتی اور بربریت پر روک لگائی گئی ہے۔ جس پر رسولؐ اللہ نے پہلے ہی روک لگادی تھی اور انتقام نہ لینے، ایک دوسرے کی عزت وآبرو کی حفاظت کرنے اور حرمت قائم کرنے کی تلقین کی تھی۔ اقوام متحدہ کی دفعہ ۱۷ میں کہا گیا ہے کہ کوئی بھی شخص ناجائز طریقے سے اپنی جائیداد سے محروم نہیں کیا جاسکتا ہے۔ وہ اپنے مال واسباب اور جائیداد کا مالک کل ہے۔ حضرت محمدؐ نے پہلے ہی وراثت کے حقوق کے قوانین کا واضح اعلان کردیا اور بے جا وصیت کو ناجائز قرار دیدیا تھا۔ بین الاقوامی منشور کی دفعہ ۱۸، ۲۷ میں مذہبی وثقافتی آزادی کی ضمانت دی گئی اور آزادی اظہار رائے، ثقافتی امور میں حصہ لینے یا نہ لینے اور کسی بھی مذہب کو اختیار کرنے کی آزادی کا حق دیا گیا ہے۔ لیکن رسولؐ خدا نے مسلمانوں کو ان کے واضح مذہبی امور کی نشاندہی کردی تھی اور مذہبی غلو ومبالغے سے پرہیز کی تلقین کی۔ جو آزادی اظہار رائے میں سب سے بڑی رکاوٹ ہوتا ہے۔ ساتھ ہی مساویانہ حقوق اور مواقع بلاتفریق دینے کا اعلان کردیا تھا۔ کیونکہ قرآن عظیم مسلمانوں اور تمام انسانوں کے لئے واضح ہدایت ہے اور خدا کا قول لکم دینکم ولی دین ۱۲ موجود تھا۔ لہٰذا اس سے بڑی مذہبی آزادی کا اور کیا تصور کیا جاسکتا ہے۔

خطبہ حجۃ الوداع اسلامی اخلاقیات، اسلام کے انفرادی واجتماعی امور اور محسنؐ انسانیت کی تمام تر تعلیمات کے خلاصہ پر مشتمل ہونے کی وجہ سے حقوق البشر کے ایک عالمی منشور کا درجہ رکھتا ہے۔ یہ خطبہ نہ تو اتنا شاعرانہ وصوفیانہ تھا جتنا کہ حضرت عیسیٰ کا

خطبہ تھا۔ اس میں ایسی دانشمندی پنہاں تھی جو نہ صرف اعلیٰ طبائع کو پسند آتی ہے بلکہ ادنیٰ طبائع کی صلاحیتوں اور تقاضوں سے بھی مطابقت رکھتی ہے اور جن کے لئے اخلاقی رہنمائی نیز مثبت ومکمل ہدایات کی اشد ضرورت ہوتی ہے۔ خطبہ حجۃ الوداع ایک ایسا دستور العمل تھا جس نے اجتماعی ترقی کا ایک ایسا نمونہ فراہم کیا تھا جس کی معنویت وافادیت آج بھی مسلم ہے کیونکہ اسلام نے انسان کی طبعی وفکری سطح کو سامنے رکھتے ہوئے جو ضابطے پیش کیے وہ بقائے انسانی کے لیے منتہی کہے جاسکتے ہیں اور جن سے نسل انسانی کا کوئی بھی معاشرہ وعہد چاہے وہ کتنا ہی پسماندہ ہو یا متمدن فیضیاب ہوکر نئی جہت وروشنی اور توانائی حاصل کرسکتا ہے۔

عرب کا وہ ایک بے خانماں شخص جس نے اپنی قوم کو حق کے لئے پکارا تو وہ اس کی دشمن بن گئی۔ لوگوں نے گالیاں دیں، پتھر مارے، قتل کرنے کی کوشش کی۔ مگر وہ حق وصداقت کا متوالا بے جاہ وحشم مبلغ اس تہذیب وتمدن نا آشنا قوم جس نے اسے ہجرت کرنے پر مجبور کردیا تھا، اس کا ہی نہیں بلکہ تمام عرب قوم کا فرمانروا بن گیا۔ جو قیصر وکسریٰ کا صرف ہمسر ہی نہ تھا بلکہ قوموں کی قسمت کا فیصلہ کرنے کا مجاز ہوگیا تھا۔ اس سب کے باوجود بھی اس کی فطرت وسیرت کے اوصاف وہی زہد وقناعت وہی نفاست وہی لطافت احساس وہی پاکیزہ دلی، وہی انکساری فروتنی وہی کریم النفسی اور ادائے فرض میں وہی جانفشانی یعنی وہ تمام خوبیاں جنھوں نے اسے ''الامین'' کا لقب دلوایا تھا، باقی رہے۔ جس نے اپنے آخری خطبہ میں ۲۳ سالہ پیغمبرانہ مشن کی مذہبی ودنیوی امور کی تعلیمات سے متعلق حجت تمام کردی تھی اور ایسا کوئی نکتہ نہ تھا جس کی تشنگی کا احساس اس کی امت کو باقی رہ گیا تھا۔ اور نتیجتاً ایک مثالی معاشرہ کی تشکیل کا عمل مکمل ہوگیا تھا۔ جس میں مثالی اعتبار سے روحانی واخلاقی پاکیزگی، فرد کی آزادی، فرد اور معاشرے کے مابین ایک توازن قائم تھا جس کی مثال انسانی تاریخ میں دیکھنے کو نہیں ملتی۔ اور یہ کام ایک ایسے معاشرے میں انجام کو پہنچا تھا جہاں تمام تر غیر اخلاقی وانسانیت سوز افعال کا رہائے نمایاں کا درجہ رکھتے تھے جہاں انسانیت ماتم کناں تھی اور پھر رسولؐ خدا کی

۲۳ سالہ محنت شاقہ نے اس معاشرہ کو نہ صرف ایک مثالی معاشرہ میں تبدیل کیا بلکہ اس معاشرہ کے افراد کو انسانیت کا علمبردار بنا کر پیش کیا۔ جن کے کردار وسیرت کو آج ہم بطور مثال پیش کرتے ہیں۔ جو رسولؐ خدا کی تعلیم وتربیت کا زبردست کرامات ومعجزانہ کارنامہ ہے جس کے اعتراف میں ۱۴ سو سال سے آج بھی انسان رطب اللسان ہے۔ سیرت وکردار کا ہر نیا مطالعہ ایک نیا اچھوتا اور روشن پہلو سامنے لے کر آتا ہے جو اس بات کا غماز ہے کہ اسلام نہ صرف ایک زندہ جاوید مذہب ہے بلکہ سب سے زیادہ متحرک اور فعال مذہب بھی ہے۔ جس کی ابدیت وآفاقیت سے انکار ممکن نہیں۔ جہاں انسانی صلاحیتوں کے اعلیٰ ترین تخلیقی اظہار کے پہلو اپنی پوری توانائی کے ساتھ زندہ ہیں۔ اور اپنی ابدی وآفاقی منزل کی طرف گامزن ہیں۔

مراجع:

۱۔ القرآن: ۹۶، سورہ العلق، آیت ۱

۲۔ روح اسلام سید امیر علی دہلی ۱۹۸۶ء ص ۲۱۰

۳۔ القرآن ۱۱۰ سورہ النصر

۴۔ خطبہ حجۃ الوداع کے متن وتفصیل کے لئے رجوع کریں

سیرہ ابن ہشام، ابو محمد عبد الملک بن ہشام جلد دوم دار المنار روڈ ۹ الباب الاخضر، میدان الحسین ص ۴۳۶-۴۳۷۔ نور الیقین فی سیرۃ المرسلین مع اتمام الوفاء فی سیرۃ الخلفاء۔ الشیخ محمد الخضری۔ ماوراء النہر ۱۹۹۲ء ص ۲۰۰-۲۰۲۔ سیرۃ النبیؐ شبلی نعمانی، اعظم گڑھ ۱۳۷۵، ص ۱۵۰-۱۶۹ رحمت عالم۔ سید سلیمان ندوی، دہلی ۱۹۴۳ء ص ۱۲۴-۱۳۱۔ تاریخ اسلام شاہ معین الدین ندوی۔ جلد ۱ اعظم گڑھ ۱۹۶۶ء ص ۸۳-۱۱۱۔ روح اسلام سید امیر علی، ص ۲۱۲-۲۱۴ حجۃ الوداع محمد ازہر عالم صدیقی دہلی ۱۹۹۹ء ص ۳۷-۴۹۔ تذکرۃ الظفر عبد الشکور ترمذی فیصل آباد، ۱۹۷۷ء ص ۱۱۲-۱۱۷ اردو دائرہ معارف اسلامیہ جلد ۱۹، لاہور ۱۹۸۶، ص ۶۲-۶۴

۵۔" امی القب عالم ارض وسماء بے سایہ سائبان عالم" از مولانا اخلاق حسین قاسمی روزنامہ راشٹریہ سہارا اردو۔خصوصی ضمیمہ جشن رحمت اللعالمین نمبر مورخہ ۱۵ جون ۲۰۰۰ ص ۱
۶۔ القرآن: ۴۹ سورۃ الحجرات، آیت ۱۳
۷۔ روح اسلام ص ۲۰۵
۸۔"خطبہ حجۃ الوداع کی سماجی حیثیت" از محمد سجاد عالم رضوی، روزنامہ راشٹریہ سہارا اردو، ہفتہ واری ضمیمہ "حج بیت اللہ نمبر" مورخہ ۲۳ فروری ۲۰۰۲ء ص ۴
۹۔ القرآن: ۵ سورہ المائدہ، آیت ۳
۱۰۔ خطبہ حجۃ الوداع کی سماجی حیثیت" از محمد سجاد عالم رضوی۔ روزنامہ راشٹریہ سہارا اردو، ہفتہ واری ضمیمہ حج بیت اللہ نمبر" مورخہ ۲۳ فروری ۲۰۰۲ء ص ۴
۱۱۔ بیسک ڈاکومینٹس ان انٹرنیشنل لاء۔ آئین براؤنلی۔ آکسفورڈ پریس لندن۔ منقول از "پندرہ روزہ دینی مشن" شمارہ ۱۳ / ۱۴، جلد ۳، مورخہ ۱۔۱۵ جولائی مورخہ ۱۶۔۳۱ جولائی ۲۰۰۲ء نئی دہلی ص ۲۔۳
۱۲۔ القرآن: ۱۰۹ سورۃ الکافرون۔ آیت ۶

حجۃ الوداع کے موقع پر فریضۂ حج کی ادائیگی کے بعد شہر مکہ سے لوٹتے وقت "غدیر خم" کے میدان میں پیغمبرؐ عظیم الشان نے غیر معمولی اہتمام کے ساتھ مولائے متقیان امیر المومنین حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام کی ولایت کا اعلان کرتے ہوئے ایک فصیح و بلیغ خطبہ ارشاد فرمایا تھا۔ انشاء اللہ پیغمبر اکرم کے اس خطبہ و واقعہ غدیر کے سلسلے میں ایک مستند مقالہ "راہ اسلام" کے آئندہ شمارہ میں پیش کیا جائے گا۔

(ادارہ)

☆☆☆

اسلامی نظام:

شہزاد علی، فاضل دینیات، دیوبند

اسلامی اتحاد ایک اہم عصری ضرورت

آج عالم اسلام کے اوپر ہر سو خطرات کے بادل منڈلا رہے ہیں کہیں خارجی مسائل ہیں تو کہیں داخلی مسائل اور ملت خود بھی انتشار کا شکار ہے۔ ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ آج جبکہ پوری دنیا اسلام کے خلاف کھڑی ہوچکی ہے ان حالات میں مسلمان ایک متحد رول ادا کرتے۔ اس کے برعکس مسلمان اپنے اختلافات نمایاں رکھے ہوئے ہیں خود اپنے ملک ہندوستان میں آئے دن اخباروں میں ایک مسلک کا دوسرے مسلک کے خلاف فتویٰ جاری ہوتے رہنا اور غیروں کا (اسلام کا) مذاق اڑانا عام بات ہوگئی ہے۔ اسلام دشمن جماعتیں آئے دن اسلام اور مسلمانوں کے خلاف زہر افشانی میں ہمہ تن سرگرم ہیں اور مسلمان خاموشی کے ساتھ سنتے چلے آرہے ہیں یہ حالات اس خیر امت' سے مطالبہ کررہے ہیں کہ مسلمان فروعی اختلافات بھلا کر ایک اسلام پر متحد ہوجائیں۔ پچاس سے زیادہ مسلم ممالک اور سوا ارب سے زیادہ افراد کی قوت مگر دنیا کی سیاست میں ہمارا کوئی رول نہیں۔ او آئی سی اور غیر جانبدار تحریک وعرب لیگ وغیرہ تو موجد ہیں مگر بے وزن ؟ ۵۷ برسوں سے مسلمانوں کے دلوں میں چبھویا گیا تیر اسرائیل اور مظلوم بے بس فلسطین قبلہ اول ؟ برداشت کرنے کو مجبور ہیں۔ پیغمبرؐ اسلام سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے گستاخ ملعون کو سیاسی پناہ؟ اسلام اور مسلمانوں کے حقوق وتحفظ کی بات کرنے والے ملک وتنظیم کو دہشت گرد قرار دیکر اس کا راستہ روکنا سب کچھ عالم اسلام کی تنزلی کے ابواب ہیں۔ عالمی تجارتی مرکز پر دہشت گردانہ حملہ کے بعد سے دہشت گردی کا ایک نیا باب وابستہ ہوگیا ہے چنانچہ صورت حال یہ ہوگئی ہے کہ اب اگر کوئی اسلام کی بات کرتا

ہے تو وہ Millitant ہے کوئی حکومت اگر اسلام کا دم بھرتی ہے تو وہ دہشت گردی کو ہوا دیتی ہے مسلمان اسرائیل کے خلاف اپنی زمین، ملک اور حق کے لئے لڑتا ہے تو دہشت گرد کہلاتا ہے۔ امت اسلامیہ کے اندرونی حالات کا بھی جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اتنے شدید خارجی حملوں کے باجود ملت غفلت کی نیند میں ڈوبی ہے اورفرقہ واریت کو ہی اپنے لئے زحمت بنائے ہوئے ہے۔کہیں ہمارا شیعہ سنی کا مسئلہ ہے تو کہیں زید یہ اسماعلیہ اور مقلد وغیر مقلد کا مسئلہ ہے ۔ان معمولی چیزوں کو ہم نے بنیادی حیثیت دے رکھی ہے جبکہ نبی رحمت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی امت دنیا کے ہر کونے میں آباد ہے اور کسی بھی مسلک سے تعلق رکھنے والا فرد فخر یہ کہتا ہے کہ ہم مسلمان ایک ملت ہیں۔ ہمارا خدا ایک ،قبلہ ایک، کتاب ایک، رسول ایک مگر جب ہم عملی میدان میں ہوتے ہیں تو اپنی مذکورہ Theory کو ثابت کرنے سے قاصر ہوتے ہیں اور ہم اس حدیث کی خلاف ورزی کرتے ہیں کہ ''مومن کا ظاہر بھی وہی ہوتا ہے جو باطن ہوتا ہے۔'' برصغیر ہندو پاک میں تقریباً یہی صورت حال ہے بلکہ پاکستان میں صورت حال بہت خراب ہوچکی ہے جہاں مسلمان نماز پڑھتے ہوئے بھی محفوظ نہیں ہیں۔ ان لوگوں کو خدا کا خوف نہیں رہا کہ کسی سنی یا شیعہ کو نہیں بلکہ مسجد میں نماز پڑھنے والے ایک نمازی کو قتل کردیا ہے اور افسوس و دکھ سے دل پھٹ جاتا ہے جب یہ ملت خود اپنے مسلکی جذبات کے مطابق مذہبی فریضہ انجام دیتے ہوئے غیروں جیسا برتاؤ کرتی ہے۔تعزیتی جلوس پر اندھا دھند گولیاں برسائی جاتی ہیں۔ حال ہی میں پاکستانی اور عراقی شہروں میں رونما ہونے والے بم دھماکوں اور تعزیتی جلوسوں پر کی جانے والی خوفناک فائرنگ سے چشم پوشی ناممکن ہے ۔ یہ سچ ہے کہ ان حوادث سے اسلام دشمن سازش کی بو آرہی ہے لیکن اس تلخ حقیقت سے انکار ناممکن ہے کہ اسلام دشمن سازشوں کو عملی جامہ پہنانے والے لوگ تو بظاہر مسلمان ہیں۔ ان دردناک حوادث کو دیکھنے کے بعد واقعہ کربلا کی یاد تازہ ہوجاتی ہے اور ایسا لگتا ہے کہ یزیدیت ایک بار پھر حسینیت پر غلبہ حاصل کرنے کی کوشش میں ہمہ تن سرگرم ہے لیکن عراق ہو یا افغانستان حسینی مقصد سے عشق

رکھنے والے دونوں ملکوں کے سنی اور شیعہ مسلمان شہادت کو گلے لگا کر یہ اعلان کر رہے ہیں کہ یزیدیت کے مقابلے میں اسلام کی بقا کے لئے عظیم قربانیوں کی ضرورت ہوا کرتی ہے۔

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ظلم برداشت کرنا عراقی قوم کا مقصد بن گیا ہے۔ ایک طویل مدت تک صدام جیسے ڈکٹیٹر کے مظالم کا سامنا کرنے کے بعد اب یہ مظلوم قوم بش اور اس کے اتحادی خونخواروں کے ظلم کا شکار بنی ہوئی ہے اور انسانیت سوز مظالم کا سلسلہ جاری ہے اور انسانی حقوق کی حمایت کا دم بھرنے والی حکومتوں پر موت کا سناٹا چھایا ہوا ہے۔

بات صرف سرزمین عراق تک ہی محدود نہیں رہ گئی بلکہ اپنے زعم ناقص میں عراق کو سبق سکھانے کے بعد امریکی نگاہیں شام اور اسلامی جمہوریہ ایران پر لگی ہوئی ہیں شام پر پابندی لگائی جا چکی ہے اور پر امن مقاصد پر مشتمل ایران کا جوہری پروگرام ان کے لئے درد سر بنا ہوا ہے مگر ایران ہی وہ واحد اسلامی ملک ہے جو منظم اور مثبت پالیسی کے ساتھ امریکہ کا ڈٹ کر مقابلہ کر رہا ہے۔ ہمیشہ ہی ایرانی قیادت اپنی اسلامی ہمہ جہتی کا ثبوت دیتی رہی اور باطل کے سامنے صدائے حق بلند کرنا اپنا فریضہ اسلامی تصور کرتی رہی ہے۔ دنیا کے نقشہ پر ہر حلقہ حیات میں اسلام کی نمائندگی کو حکومت ایران اپنا فریضہ تسلیم کرتی ہے اور وہ اپنے مقصد میں کامیاب بھی ہے

یہ وہ مختصر صورت حال ہے جو عالم اسلام پر گزر رہی ہے مگر آیئے ایک لمحہ کے لئے غور کریں کہ جب ہم نے شہادت دی اشھد ان لاالہ الا اللہ واشھد ان محمد عبدہ ورسولہ کہا تو اس کا یہی مطلب یہی ہے کوئی معبود نہیں ہے سوائے اللہ کے یعنی نفع ونقصان اور عزت وذلت اللہ کے ہاتھ ہے۔ محمد رسول اللہ خاتم النبیین ہیں۔ اور اللہ کے ذریعہ اپنے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو عطا کئے گئے دستور حیات یعنی قرآن مجید جس پر ہر مسلمان کا بھرپور عقیدہ و ایمان ہے اور ہر معاملہ میں بس اسی کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ ایک مشہور حدیث میں ارشاد نبویؐ ہے "میں تمہارے درمیان دو چیزیں چھوڑے جا رہا ہوں اگر ان کو مضبوطی سے

پکڑے رکھو گے تو کبھی گمراہ نہ ہو گے ایک اللہ کی کتاب دوسرے میرے اہلبیت کی محبت'' تمام مسلکوں کا اس پر اتفاق ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔'' اور آپس میں جھگڑنا مت ورنہ تمہارے اندر کمزوری آجائے گی اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی۔ اللہ پاک نے جھگڑے سے دور رہنے کی تلقین فرمائی ہے اور ایسا نہ کرنے پر برے انجام کی نشان دہی فرمائی ہے۔ آیت کریمہ میں جو تنبیہ کی گئی ہے آج کی صورت حال اور نتیجہ تقریباً وہی ہے۔ سورہ الحجرات میں ارشاد ہے۔ ''مومن تو آپس میں بھائی بھائی ہیں بس اپنے دو بھائیوں میں صلح کرادو اور اللہ کا ڈر رکھو تا کہ تم پر رحم کیا جائے (۴۹/۱۰) بلکہ افراد کی سطح سے آگے بڑھ کر اللہ نے مومنوں کو حکم دیا کہ اگر دو جماعتیں یا گروہ آپس میں لڑ پڑیں تو ان کے بیچ صلح کرادو۔ (۴۹/۹) آج ملت کے درمیان دو طرح کے اختلافات ہیں۔ ا۔ سیاسی اختلاف۔ ۲۔ مسلکی اختلاف۔ پہلی قسم کا اختلاف وقتی ہے مگر دوسری قسم کا اختلاف معاشرے کی جڑ تک پھیلا ہوا ہے۔ اس میں کچھ علماء بھی برابر کے شریک ہیں۔ کبھی آئمہ وخلفاء تو کہیں تقلید اور عدم تقلید کا مسئلہ پیدا ہوتا ہے اور خرابی اس وقت پیدا ہوتی ہے جب ایک مسلک کے لوگ دوسرے مسلک کو باطل بتا کر اپنے آپ کو اسلام کا صحیح نمائندہ اور علمبردار بتانے لگتے ہیں۔ یہ تو ٹھیک ہے کہ اپنے مسلک پر قائم رہا جائے مگر اس میں شدت اختیار کرنا غیر مناسب ہے کیونکہ نبی آخر الزماںؐ کا ارشاد گرامی ہے۔'' خبردار انتہا پسندی میں نہ پڑنا کیونکہ تم سے پہلے لوگ دین میں انتہا پسندی اختیار کر کے ہی تباہ ہو گئے'' اور یہ کہ جو نرم خوئی سے محروم ہوا وہ بھلائی سے بالکل محروم ہو گیا۔ (مسلم و بخاری) بنیادی سوال یہ ہے کہ ان احکامات نبوی کی روشنی میں ہم اپنا محاسبہ کیوں نہیں کرنا چاہتے ہیں؟

بدقسمتی کہ کی بات ہے آج ہم کو صرف مسلمانوں کو متحد کرنے کے لئے جدوجہد کرنا پڑ رہی ہے جبکہ اللہ اپنے رسول کو غیر مسلموں اہل کتاب تک سے آپس میں مشترکہ چیزوں پر اتفاق کرنے کی دعوت دے رہا ہے۔'' اے اہل کتاب جو بات ہمارے تمہارے درمیان یکساں ہے اس کی طرف آؤ۔ یہ کہ خدا کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں اس کے ساتھ کسی کو

شریک نہ بناکیں۔ (۳/۶۱) یہ آیہ مبارکہ یقیناً مشعل راہ ہے کیونکہ یہاں مسلمانوں کو غیر مسلموں سے اتحاد و اتفاق کی دعوت دی جارہی ہے۔ جبکہ مسلمانوں نے اس سے کوئی سبق نہیں لیا۔ دوسرے مقام پر قرآن پاک فرماتا ہے "مومن مرد اور مومن عورتیں آپس میں ایک دوسرے کے دوست ہیں۔ (۹/۷۱) مومن مومن کے لئے اس دیوار کی طرح ہے جس کی ایک اینٹ دوسری اینٹ کی مضبوطی کا ذریعہ ہے (مسلم و بخاری) آپس میں ایک دوسرے سے بغض نہ کرو حسد نہ کرو ایک دوسرے سے پیٹھ نہ پھیرو سب اللہ کے بندے بھائی بھائی بن جاؤ (ابوداؤد) قرآن وحدیث پر ایمان رکھنے والوں کے لئے یہ ہدایات کافی ہیں اور اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھام لو اور فرقہ فرقہ میں نہ بٹو۔ (۳/۱۰۳)

افسوس کہ اتنی واضح تعلیمات کے باوجود عوام سے آگے کچھ علماء دین بھی اتحاد کے مسئلہ پر اسلامی تعلیمات کو نظر انداز کردیتے ہیں آج دشمن تو ہمارے خلاف صف بستہ ہوچکے ہیں مگر ہم فقہی اور جماعتی گروہ بندیوں میں جکڑے ہوئے ہیں۔ قائد انقلاب اسلامی حضرت آیت اللہ خمینیؒ کی تقریر کا اقتباس بھی ملاحظہ فرمائیں۔ آپ نے علماء اہل سنت سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا تھا۔ "آپ لوگ بخوبی جانتے ہیں کہ ہمارے درمیان پھوٹ ڈالنے کی یہ سازشیں طائف کانفرنس میں کی گئی ہیں۔ الحمدللہ آپ یہ بھی جانتے ہیں کہ جو لوگ پھوٹ ڈالنے کی کوشش کررہے ہیں وہ نہ شیعہ ہیں نہ سنی درحقیقت ان لوگوں کا اسلام سے کوئی سروکار نہیں ہے۔ وہ لوگ جو اسلام پر پختہ یقین رکھتے ہیں ایک ایسے وقت میں جبکہ ہمیں دوسری حملہ آور قوموں پر فتح حاصل کرنے کے لئے ایک سخت اتحاد کی ضرورت ہے کبھی بھی آپس میں اختلاف کو بھڑکانے کے مرتکب نہیں ہوسکتے۔ یہ بھی ایک انکشاف حقیقت ہے کہ بڑی طاقتیں یہ خوب سمجھتی ہیں کہ ہمیں شکست دینے اور ہماری جڑیں کاٹنے والی اگر کوئی idealogy ہے تو وہ اسلام ہے اور مسلمانان عالم کے درمیان اتحاد و اخوت ہی کا راستہ ہے یہی وجہ ہے کہ وہ ہمارے اندر آپس میں اختلافات پیدا کرنے اور انہیں بھڑکانے کی کوششوں میں مصروف

ہیں۔'' مگر یہ اتحاد مخلصانہ محبت کے بغیر ناممکن ہے جیسا کہ مفکر اسلام مولانا سید ابو العلیٰ مودودی فرماتے ہیں۔ ''جس طرح ایک عمارت اسی وقت ممکن ہوسکتی ہے جبکہ اس کی اینٹیں باہم مضبوطی کے ساتھ پیوستہ ہوں اور اینٹوں کو جوڑنے والی چیز سیمنٹ ہے۔ اسی طرح ایک جماعت بھی اسوقت بنیان مرصوص بنتی ہے جبکہ اس کے ارکان کے دل ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہوں..... منافقانہ میل جول کوئی حقیقی اتحاد پیدا نہیں کرسکتا۔'' ہمارا ہر مسلک کے علماء دین سے التماس ہے کہ عوام کو دوسرے مسلک اور اس کے جذبات کا احترام سکھایا جائے قرآن کریم و حدیث مبارکہ کے بعد فقہ کے مسئلہ کو عملی روپ سے لیا جائے۔ ایک مسلک کے عوام کو ضرورت پڑنے پر دوسرے مسلک کے امام کی اقتدا میں نمازیں پڑھنے کی ترغیب دلائی جائے تبھی عوام سب کو بھائی بھائی سمجھیں گے اور ایک مخلصانہ ماحول پروان چڑھے گا۔ بقول مولانا سید ابو العلیٰ مودودی۔ ''شیعہ وسنی اور دیوبندی وبریلوی وغیرہ اسلام کی پیداوار نہیں بلکہ جہالت کی پیداوار ہیں۔'' اور خبردار کہ ''اللہ کے عذاب کی ایک صورت یہ بھی ہوسکتی ہے کہ ہم کو مختلف فرقوں میں تقسیم کردے۔''

☆☆☆☆☆☆

وصی جعفری

شیر مادر کی
اسلامی اور سائنسی اہمیت وافادیت

خالق کائنات نے جب کرہ ارض کو اپنی مخلوقات سے آباد کرنا چاہا تو اس نے پانی کو روانی سبزوں کو ہریالی اور گلوں کو نکہت عطا کرنے کے بعد دیگر مخلوقات کی تخلیق کا سلسلہ شروع کیا۔ جب یہ زمین ہر طرح سے سرسبز وشاداب اور پر بہار نظر آنے لگی تو اب قدرت نے روح بہار کے نزول کا ارادہ کیا اور لفظ ''کن'' نے مجسمہ آدم میں روح پھونک دی۔ انھیں اشرفیت کا تاج پہنا کر جنت کا مکیں بنایا گیا اور پھر دنیا کی عارضی سکونت کے لئے روانہ کردیا گیا۔ یہ ابو البشر جب کرۂ ارض پر آیا تو اب تقاضائے فطرت کے تحت حکم خداوندی سے حضرت حوا کو بھی وارد ارض ہونا پڑا اور یہیں سے بشریت کا آغاز ہوا، باپ، ماں، بیٹے بیٹیاں، بھائی اور بہن اس طرح سلسلہ درسلسلہ نسل بشریت آگے بڑھتی رہی۔

رب العالمین نے جب نسل بشریت کا آغاز کیا تو اس میں وہ تمام صفات وخصوصیات ودیعت کردیں جو بقائے نسل کے لئے ضروری تھیں۔ جہاں ماں باپ کی عظمتوں کا اعلان کیا گیا وہیں اولاد کی پرورش وپرداخت کے لئے ان کے حقوق کی ادائیگی کا تذکرہ کیا گیا۔ یہ بشر عرصہ دراز تک اپنی فطرت پہ قائم بھی رہا لیکن زمانہ کی چمک دمک فیشن کی باڑھ، حسن پرستی اور مادیت پسندی نے کہیں حقوق تلفی کی تو کہیں قوانین سے گریز کا راستہ اختیار کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ انسان نے فطرت کے قوانین سے منہ موڑنا شروع کیا جس کی وجہ سے پریشانیوں، صعوبتوں، بیماریوں اور دیگر آفتوں کا سلسلہ شروع ہوگیا۔

سلسلہ نسل کا دارو مدار اولاد پر ہوتا ہے۔ ہر انسان چاہتا ہے کہ اس کی نسل باقی رہے یہی نہیں بلکہ اس کی نسل میں اعلیٰ ظرف باصلاحیت، خوب سیرت اور ہنر مند اولادوں کا سلسلہ قائم ہو تا کہ ایک اچھا معاشرہ تشکیل پا سکے لیکن جہاں ایک طرف یہ خیالات ہوتے ہیں وہیں دوسری طرف انسان جذبات کے دھارے میں اتنا بہہ چکا ہوتا ہے اس کا خواب شرمندہ تعبیر نہیں ہو پاتا۔ اولاً تو شریک حیات کے انتخاب میں اس معیار کو قائم نہیں رکھ پاتا اور اگر شریک حیات کا انتخاب صحیح یا غلط ہو بھی گیا ہے تو پھر سلسلہ نسل کی شروعات اس انداز سے نہیں ہو پاتی کہ وہ اپنی اولاد کے تئیں اپنے مقصد میں کامیاب ہو سکے۔ دنیا میں بچے کی آمد کے بعد ہی اکثر اسے اس کے اولین حق یعنی شیر مادر کی فراہمی سے محروم رکھا جاتا ہے جس کی بنا پر نہ اس کی پرورش و پرداخت اچھی ہو پاتی ہے اور نہ ہی اس میں والدین کی خصوصیات کما حقہ، آپاتی ہیں اس لئے کہ یہ قانون فطرت ہے کہ جو بویا جاتا ہے وہی اگتا ہے۔ جب بچہ ماں کے دودھ سے محرورم رکھا جائے گا تو پھر اس میں انسان کی خصوصیت کیسے پیدا ہو سکتی ہے! اسی لئے قرآن، حدیث اور سائنس نے بھی اس بات پر زور دیا ہے کہ بچہ کہ ماں کا دودھ پلایا جائے تا کہ انسانیت کو فروغ حاصل ہو سکے۔

شیر مادر کی خصوصیات:

شیر مادر کی پوری خصوصیات کا اندازہ کوئی نہیں لگا سکتا۔ اس میں کون کون سے جوہر نعال پوشیدہ ہیں وہ تو بس خالق کل کے ہی علم میں ہے۔ البتہ اب تک جن خصوصیات اور جواہرات کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے وہی شیر مادر کی اہمیت کو اجاگر کرنے کے لئے کافی ہیں۔ اسی لئے ادارہ عالمی صحت (WHO) نے ایک نعرہ دیا (Mother's milk is best for baby)

☆ ماں کے دودھ میں وہ تمام بنیادی اجزاء موجود ہوتے ہیں جو بچہ کی ہڈیوں، اعصاب (Nerves)، عضلات (Muscles) اور انسجہ (Tissues) کی غذائیت کے لئے

کافی ہوتے ہیں اور جب بھرپور غذائیت ملتی ہے تو اچھی نشوونما ہوتی ہے۔

☆ ماں کا دودھ پاک، مطہر اور صاف ہوتا ہے اس میں کسی طرح کے جراثیمی اثرات کا امکان نہیں ہوتا اور یہ ہر وقت دستیاب ہوتا ہے۔

☆ اس کا درجہ حرارت بہت ہی مناسب ہوتا ہے۔

جسم انسانی چھ اہم اجزاء سے تشکیل پاتا ہے جن کا تناسب حسب ذیل ہے۔

الف۔ پانی (H_2O) ۶۴ فیصد

ب۔ لحمیات (Protiens) ۱۷ فیصد

ج۔ شحمیات (Fats) ۱۲ فیصد

د۔ نشاستہ (Carbohydrate) ۱۲ فیصد

و۔ حیاتین (Vitamins) اور معدنیات (Minerals) ۷ فیصد

ماں کے دودھ میں یہ تمام ضروری اجزاء انتہائی تناسب کے ساتھ ہوتے ہیں اور جیسے جیسے بچہ کو ان اجزاء کی ضرورت ہوتی ہے قدرت اسی حساب اور مقدار میں وہ اجزاء دودھ میں فراہم کر دیتی ہے۔ ماں کا دودھ بچہ کو جتنا غذائیت فراہم کرتا ہے اتنا ہی اس میں جذباتی اور نفسیاتی اقدار بھی اجاگر کرتا ہے۔

شیر مادر کا اسلامی نظریہ:

اسلام نے شیر مادر کو اتنی اہمیت دی ہے کہ خود قرآن مجید میں اس کا تذکرہ وارد ہوا ہے اور جہاں رضاعت کی بات کہی گئی ہے وہیں اس کی مدت بھی بیان کی گئی ہے چنانچہ رضاعت کے سلسلہ میں ارشاد ہوتا ہے۔" والوالدات یرضعن اولادھن حولین کاملین لمن اراد ان یتم الرضاعة....."

(ترجمہ) " جو شخص اپنی اولاد کو پوری مدت تک دودھ پلوانا چاہے تو اس کی خاطر سے مائیں اپنی اولاد کو پورے دو برس پلائیں" رضاعت کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے بھی

لگایا جاسکتا ہے کہ جہاں قرآن نے ماؤں کو دودھ پلانے کا حکم دیا ہے وہیں باپ کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ وہ اپنی مرضعہ بیوی کے لئے کھانے کپڑے وغیرہ کا انتظام کرے۔ اگر بیوی کو طلاق دے چکا ہے لیکن وہ مطلقہ عورت اس کے بچہ کو دودھ پلارہی ہے تو اس کے لئے بھی قرآن پاک میں حکم ہوا ہے کہ ''فان ارضعن لکم فاتوھن اجورھن۔''[۲] ترجمہ ''اگر وہ (مطلقہ عورت) بچے کو تمہاری خاطر سے دودھ پلائیں تو انھیں مناسب اجرت دو۔''

اگر شیر مادر کی کوئی اہمیت نہ ہوتی تو ارشاد ہوسکتا تھا کہ طلاق کے بعد عورت کی ذمہ داری نہیں کہ وہ اپنے شوہر کے بچہ کو دودھ پلائے۔ اب یہ باپ کا فرض ہے کہ وہ جیسے چاہے اپنے بچہ کی پرورش کا انتظام کرے۔ لیکن قرآن کا یہ حکم عورت کی اہمیت کو واضح کررہا ہے دوسری طرف شیر مادر کی اہمیت کی نشاندہی کررہا ہے۔

شیر مادر اور حدیث:

اگر ہم احادیث کا مطالعہ کریں تو اس میں بھی شیر مادر کی اہمیت کے تذکرے ملتے ہیں اور بچوں کی پرورش کے لئے شیر مادر کو منفعت بخش اور مفید قرار دیا گیا ہے۔ نیز اگر ماں موجود نہ ہو تو کیسی عورتیں دودھ پلانے کا حق رکھتی ہیں اور کن عورتوں کو شیر دعی پر مامور کیا جانا چاہئے اس کی بھی تاکید کی گئی ہے۔

چنانچہ آنحضرتؐ فرماتے ہیں کہ ''ایسی عورتوں سے دودھ نہ پلواؤ جو احمق (بے قوف) ہوں یا جن کی آنکھ میں عیب ہو۔ کیونکہ دودھ بچہ میں اثر کرتا ہے۔''[۳]

آج کی Genetic Theory نے یہ ثابت کردیا ہے کہ ماں باپ کے اثرات بچے پر یقیناً مرتب ہوتے ہیں اور اکثر مشاہدہ میں بھی یہ بات آتی ہے کہ اگر ماں بے قوف ہے تو اولاد بھی بے قوف ہوتی ہے اور اگر ماں کی آنکھوں میں عیب ہے تو بچے بھی معیوب ہوجایا کرتے ہیں۔ اسی لئے اگر ماں کو دودھ نہ اترتا یا ماں کسی وجہ سے اپنے بچے کو دودھ نہ پلاسکتی ہو تو ایسے موقع کے لئے اچھی دایہ کا انتخاب کرنا چاہئے۔ چنانچہ مولائے کائنات حضرت علیؑ

فرماتے ہیں۔''دایہ ایسی ہو جو سیرت وصورت دونوں میں اچھی ہو کیونکہ دودھ بچہ میں سرایت کرتا ہے اور بچہ سیرت وصورت دونوں میں دایہ سے مشابہ ہوتا ہے''۔ ۷ اور پھر فرماتے ہیں کہ ''بچہ کے لئے سب سے زیادہ تغذیہ بخش اور سب سے زیادہ مبارک اس کی ماں کا دودھ ہے۔'' ۸

مدت شیر دہی کے سلسلہ میں حضرت جعفر صادق فرماتے ہیں کہ ''جو لوگ ۲۱ مہینہ سے کم دودھ پلاتے ہیں وہ اپنے بچے پر ظلم کرتے ہیں۔''

شیر مادر جدید سائنس کی روشنی میں:

ایک عہد تک مغربی دنیا نے فطرت کے اس قانون سے گریز کیا اور اس گریز کو حسن کی بقا کا سبب سمجھا جاتا رہا۔ پورا سماج اس عمل کو صحیح اور حق بجانب تسلیم کرنے لگا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ رفتہ رفتہ اس فیشن پرستی نے زحمت کی شکل اختیار کرلی اور جہاں بچوں کو ماں کا دودھ ملنے کی وجہ سے ان کی ذہنی وجسمانی نشو ونما میں خلل واقع ہوا وہیں ایسی عورتوں کو بھی طرح طرح کی پریشانیوں اور بیماریوں کا سامنا کرنا پڑا بالآخر عالمی ادارۂ صحت (WHO) نے عورتوں کو Breast Feeding کی طرف متوجہ کرنے کے لئے طرح طرح کے پروگرام شروع کیے تاکہ مائیں اپنے بچوں کو دودھ پلانے کی طرف راغب ہوسکیں۔

بچوں پر شیر مادر کا اثر:

ماہرین امراض اطفال، اطباء اور سائنس داں اس بات پر متفق ہیں کہ شیر مادر بچوں کے لئے مندرجہ ذیل خصوصیات رکھتا ہے۔

☆ شیر مادر بچوں کی زندگی کی بہترین بنیاد ہے۔

☆ یہ بچوں کو مکمل غذائیت فراہم کرتا ہے۔

☆ یہ بچوں کو تندرست وتوانا رکھتا ہے

☆ یہ مختلف قسم کے تغذیہ سے بچوں کو محفوظ رکھتا ہے۔ ایسے بچے ہیضہ، پیچش اور پیٹ کی

دیگر بیماریوں سے محفوظ رہتے ہیں۔

☆ شیر مادر بچوں میں حساسیت (Allergies) سے تحفظ کا ایک اہم ذریعہ ہے۔

☆ یہ ضیق النفس (Asthama) سے بچوں کو محفوظ رکھتا ہے۔

☆ ایک امریکی محقق کے مطابق پہلا رقیق مادہ جو Colustrum کہلاتا ہے (ولادت کے بعد عورت کے پستانوں سے آتا ہے) نومولود کے لئے اکسیر کا حکم رکھتا ہے۔ اس میں ہر خطرناک بیماری سے بچاؤ کے مادے ہوتے ہیں جو تمام عمر اس بچے کی نشوونما میں مدد کرتے ہیں۔

☆ ماں کا دودھ نہ صرف یہ کہ بچوں کی دماغی نشوونما کرتا ہے بلکہ یہ جسم میں ایسی قوت مدافعت پیدا کرتا ہے جس کی وجہ سے بچہ عام کمزوری اور متعدی امراض سے محفوظ رہتا ہے۔

☆ بعض ماہرین نے یہ تجربہ بھی کیا ہے کہ جن بچوں کی پرورش ماں کے دودھ سے ہوتی ہے ان میں ماں باپ کی محبت ان بچوں کے مقابلہ میں زیادہ ہوتی ہے جن کی پرورش ماں کے دودھ کے علاوہ دیگر ذرائع سے ہوتی ہے۔

رضاعت کے فوائد:

اگر کوئی عورت اسلامی احکامات اور سائنسی نظریات کے پیش نظر اپنے بچے کو دودھ پلاتی ہے تو نہ صرف یہ کہ اس کا بچہ صحت مند اور تندرست وتوانا ہوگا بلکہ خود ماں کو بھی اس سے مندرجہ ذیل فوائد حاصل ہوں گے۔

۱۔ ایسی عورتوں کا سلسلہ تولید وتناسل برقرار رہتا ہے۔

۲۔ یہ خون نفاس کو روکنے میں معاون ثابت ہوتا ہے۔

۳۔ اس سے ماں کی جسمانی قوت مدافعت میں اضافہ ہوتا ہے۔

۴۔ اکثر شیر دہندہ عورت دوران رضاعت حاملہ ہونے سے محفوظ رہتی ہے۔

۵۔ دودھ پلانے والی عورتیں ثدیین (Breasts) اور رحم (Uterus) کے سرطان

(Cancer) سے محفوظ رہتی ہیں۔

۶۔پیدائش سے قبل کی پیٹ پر جمی ہوئی چربی دودھ پلانے سے گھل جاتی ہے۔جس سے پیٹ بڑھتا نہیں ہے۔

۷۔پہلے چھ ماہ میں ماں کا دودھ نہ صرف یہ کہ بچوں کی نشوونما میں اہم رول ادا کرتا ہے بلکہ اس سے مالی منفعت ، وقت کی بچت کے ساتھ ساتھ خاندان دیگر تک ودو سے بھی محفوظ رہتا ہے۔

ان تمام نظریات کے پیش نظر ہم یہ کہہ سکتے ہیں ماں اپنے بچوں کو دودھ پلا کر نہ صرف یہ کہ قانون فطرت کی پابندی کر کے مستحق اجر وثواب ہوتی ہے بلکہ خود اپنی اور اپنی اولاد کے صحت مند ہونے کا سبب بھی بنتی ہے۔

حوالے:

۱۔سورہ بقرہ:۲۳۳

۲۔سورہ طلاق:۶

۳۔حلیۃ المتقین فارسی ص۔ ۹۱

۴۔حلیۃ المتقین فارسی ص۔ ۹۰

۵۔حلیۃ المتقین فارسی ص۔ ۹۰

☆☆☆

ڈاکٹر محمد منصور عالم، کولکاتا

انیسویں صدی کے بنگال کا باکمال فارسی شاعر
سید محمود آزاد

فارسی زبان وادب کی شجر کاری ہندوستان میں انتہائی کامیاب ثابت ہوئی۔ اس میں ایسے پھول اور شگوفے کھلے کہ انھیں ایران میں مہکنے والے گل ولالہ کے برابر رکھنے میں ذرا بھی ہچکچاہٹ محسوس نہیں ہوتی۔ مگر موسم اور حالات کی تبدیلی نے اس کی نشوونما کے تمام مواقع ختم کردیئے۔ حکومت برطانیہ کی جانب سے ۱۸۳۷ء میں جاری کردہ لسانی ایکٹ نے اس کی رہی سہی ساکھ بھی ختم کردی۔

فارسی زبان کی قلم کاری سے پیدا ہونے والی اردو زبان اب پل کر جوان ہوچکی تھی۔ انیسویں صدی کے وسط تک اس کی گھن گرج پورے ہندوستان میں سنی جارہی تھی۔ اردو زبان میں شعر کہنے والے شعراء کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہوتا جارہا تھا۔ مگر وہ بذات خود فارسی زبان کے مقابلے میں اردو شاعری کو کوئی مقام دیتے ہوئے جھجک محسوس کرتے تھے۔ مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ (۱۷۹۷ء۔۱۸۶۹ء) نے اردو زبان میں انتہائی بلند پایہ اشعار کہے مگر فارسی شاعری کے مقابلے میں وہ اسے ریختہ کہہ کرٹالتے رہے۔

اس زمانے کے ایک اور مشہور شاعر نواب سید محمود آزادؔ (۱۸۴۲ء۔۱۹۰۷ء) کی ادبی مجلسیں ڈھاکہ میں روشن ہوتی رہیں۔ مرزا غالبؔ کی طرح انھوں نے بھی فارسی زبان کے ساتھ ساتھ اردو زبان میں اشعار کہے، مگر ان کی اردو شاعری محض منہ کا ذائقہ بدلنے کی کوشش

ہے۔ اس لئے کہ دیوان میں جہاں ان کے فارسی اشعار کی تعداد ۱۴۴۳ ہے، وہاں اردو اشعار صرف ۱۶۱ ہیں۔

مرزا غالب کی طرح محمود آزاد کو بھی اپنی فارسی شاعری پر ناز تھا، کہتے ہیں:

آزاد نظم ریختہ کچھ میرا فن نہیں

واقف ہیں فارسی کے میرے شعر تر سے آپ

مولوی رحمٰن علی طیش، مصنف ''تواریخ ڈھاکہ'' اپنی کتاب میں محمود آزاد کے متعلق لکھتے ہیں:

''مولوی سید محمود عرف مجھلے سید صاحب خلف سید اسد الدین حیدر ابن سید علی مہدی خان بہادر خلف میر اشرف علی رئیس ڈھاکہ' آپ کے اشعار گہر بار متانت و فصاحت و بلاغت سے مملو ہیں۔ آپ صاحب دیوان ہیں اور علاوہ دیوان کے بہت سا کلام آپ کے شاگرد رشید خواجہ محمد افضل صاحب کے پاس موجود ہے۔ جن میں سے بطور مشتے از خروارے ہدیہ ناظرین ہے۔ آپ ارشد تلامذہ حافظ ضیغم صاحب ہیں۔ آپ کے فارسی قصائد سمجھنے کے لئے معمولی استعداد کافی نہیں ہے۔ آپ کو بے حد شوق کتب بینی تھا چنانچہ انتقال کے کچھ پیشتر آپ باحواس تھے، اساتذہ کے دواوین مد نظر رہا کرتے تھے اور قیلولہ کے بعد برابر آپ مطالعہ فرماتے تھے۔ ایک لاکھ چیدہ اشعار از بر تھے۔ (العہدہ علی الراوی) بقول خواجہ محمد افضل ایک مرتبہ دو روز میں پانچ ہزار اشعار سنائے تھے۔ آپ نے فالج سے قریب ۶۵ سال کی عمر میں ۱۹۰۷ء میں رحلت فرمائی۔ اوائل میں اپنا تخلص شیدا کیا کرتے تھے۔ آپ کی مثنوی ذوبحرین بمدح سر عبد الغنی مرحوم قابل دید ہے۔ آپ نے واقعہ ڈھاکہ ٹورینڈو نظم کیا۔''

حکیم حبیب الرحمٰن اپنی کتاب ''ثلاثہ غسالہ'' میں آزاد سے متعلق یوں رقمطراز ہیں:

''سخنور یگانہ فخر زمانہ فارسی میں اہل زبان رشک کرتے اور معلوم ہو کہ مومن کے رنگ میں ان سے بہتر کہنے والا آج تک پیدا نہیں ہوا۔ سید اسد الدین حیدر کے صاحبزادے اور مشہور

رئیس ڈھاکہ میر اشرف علی کے پوتے تھے۔ آغا احمد علی مرحوم ان کے استاد تھے۔ جو کچھ حاصل کیا انہیں سے حاصل کیا۔ شاعری کا شوق ابتدائے عمر سے تھا۔ پہلے شیدا تخلص کرتے تھے۔ چنانچہ موید برہان میں جو تقریظ ہے، وہ اسی نام سے چھپی ہے۔ اردو میں بہت کم کہتے تھے مگر جب کہتے تھے تو مومن کی یاد تازہ ہوجاتی تھی۔ ذی اخلاق، مہذب اور پابند وضع بزرگ تھے۔ کم سنوں کی حوصلہ افزائی ان پر ختم ہوتی تھی۔ زندگی بھر سہ پہر کو دولت کدے پر ایک مختصر سا مجمع شائقین شعر وسخن رہتا تھا۔ ۱۹۰۷ء میں انتقال فرمایا۔ لنگر خانہ کی مسجد کے قبرستان میں مدفون ہیں۔ ان کے فارسی اور اردو کلام کا مجموعہ دیوان آزاد کے نام سے محفوظ ہے۔ آزاد ۱۸۴۲ء کے اواخر یا ۱۸۴۳ء کے شروع میں ڈھاکہ میں پیدا ہوئے۔ ابتدا میں آغا علی احمد سے پھر عبدالغفور نساخ کی وساطت سے ضیغم سے شرف تلمذ حاصل رہا۔ جب غالب کلکتہ آئے تو آزاد وہیں تھے۔ مرزا سے ملاقات کیا ہوئی کہ زندگی بھر انہیں کے ہوکر رہ گئے۔"

آزاد کے ہم عصر اور اپنے زمانے کی مقتدر ادبی شخصیت رضا علی وحشت (۱۸۸۱ء-۱۹۵۶ء) نے بھی فارسی شاعری سے ان کی گہری وابستگی کا ذکر کیا ہے۔ ہندستان اور ایران میں فارسی کو شعراء کے ایک تذکرہ نگار لطیف الرحمٰن نے اپنی کتاب "تجلیات شعرستان فارسی" میں محمود آزاد کی حالات زندگی پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ ان کے مطابق محمود آزاد کے پردادا، امیر اشرف علی اصفہان سے ترک وطن کرکے ہندستان آئے اور موجودہ بنگلہ دیش کی راجدھانی ڈھاکہ میں سکونت پذیر ہوئے۔ اپنی شرافت، ذہانت اور فیاضی کی وجہ سے انھوں نے بہت جلد مقامی لوگوں کے دل جیت لیے اور شہر کے معزز اور مقتدر امراء میں شمار کیے جانے لگے۔ ان کے بڑے صاحبزادے میر مہدی علی، محمود آزاد کے دادا تھے۔ والد کا نام سید اسد الدین حیدر تھا۔ سید محمد آزاد، جن کے مضامین 'اودھ پنچ' میں شائع ہوتے تھے' ان کے برادر حقیقی تھے۔ سید محمود آزاد ۱۸۴۲ء میں ڈھاکہ میں پیدا ہوئے۔ گھرانہ بہت متمول اور خوشحال تھا۔ اس لئے ان کی پرورش وپرداخت نازونعم میں ہونے لگی۔ لہذا ابتدائی زندگی شاہانہ

گزری۔ مگر دھیرے دھیرے خاندانی جائیداد ختم ہونے لگی۔ مناسب ذریعہ آمدنی نہ ہونے کے سبب وہ ملازمت کی تلاش میں اپنے بھائی محمد آزاد کے ہمراہ کلکتہ چلے آئے اس وقت سید نواب عبداللطیف خان بہادر (۱۸۲۸ء۔۱۸۹۳ء) کلکتے میں انتہائی با اثر شخصیتوں میں شمار کیے جاتے تھے۔ برطانوی حکومت میں انھیں کافی اثر ورسوخ حاصل تھا۔ ملازمت کے سلسلے میں انھوں نے دونوں بھائیوں کو انٹرویو میں حاضر ہونے کا مشورہ دیا۔ وقت مقررہ پر وہ اس جگہ پہنچ گئے جہاں کوئی انگریز افسر اس کام کے لئے تعینات تھا۔ مگر امیدواروں کی لمبی قطار دیکھ کر محمود آزاد پریشان ہوگئے اور اپنی باری آنے سے قبل ہی چلے آئے۔ جبکہ ان کے بھائی محمد آزاد بیٹھے رہے۔ انھوں نے تشفی بخش انٹرویو دیا اور ان کی تقرری ہوگئی۔ وہ اسپیشل سب رجسٹرار بنادیے گئے۔ ۱۹۱۴ء میں وہ صوبۂ بنگال اور بہار کے شعبہ رجسٹریشن کے انسپکٹر جنرل کے عہدے سے سبکدوش ہوئے۔

سید محمد آزاد ایک الگ طبیعت کے انسان تھے۔ انھوں نے سرکاری ملازمت کرنا کسی صورت میں گوارا نہ کیا۔ آخر کار وہ ڈھاکہ لوٹ گئے۔ یہاں گزر بسر کا کوئی مناسب ذریعہ نہ تھا۔ بقیہ زندگی انھوں نے شدید عسرت اور غربت میں گزاری۔ ۱۹۰۷ء میں ڈھاکہ میں ان کا انتقال ہوا۔ اور شہر کی لنگر خانہ مسجد سے متصل قبرستان میں دفن کیے گئے۔

محمود آزاد نے اپنے دیوان کے دیباچے میں اپنے حالات زندگی سے متعلق کچھ نہیں لکھا ہے، تاہم ان کے اشعار میں تنگ دستی اور پریشان حالی کا نوحہ ضرور ہے۔ قسمت آزمائی کے لئے انھوں نے سفر کلکتہ کا ذکر ضرور کیا ہے۔ سفر کلکتہ سے متعلق ایک قصیدہ تمام تفصیلات فراہم کرتا ہے۔ اشعار سے پتہ چلتا ہے کہ موسم سرما میں انھوں نے سمندر کے راستے ڈھاکہ سے کلکتہ تک کا سفر کیا۔ ایک تو تکلیف دہ موسم، دوسرے عزیزوں اور رشتہ داروں کو چھوڑنے کا غم انھیں راستے بھر پریشان کرتا رہا۔ بڑے ہی دل سوز انداز میں وہ اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہیں:

زنگل زمین وطن در چنین زمان کہ کسی
نمی کند حرکت از مقر خود بہ جہان
بہ سیلی ستم دھر و گردشِ تقدیر
روان بہ جانب کلکتہ ام بہ صد حرمان
میان کشتی چرخ نشستہ ام مغموم
جگر گداختہ از رنجِ دوری یاران

محمود آزاد کو تاریخ گوئی میں بڑی مہارت حاصل تھی ۔ مگر اس قصیدے میں ایسا کوئی شعر موجود نہیں جس سے ان کی کلکتہ آمد کی تاریخ کا پتہ چلے۔ کلکتہ میں ان کے قیام کی مدت اور سرگرمیوں کی کوئی تفصیل موجود نہیں ۔ ان کے ایک ہم عصر رضا علی وحشت نے ان کا تذکرہ اس انداز سے کیا ہے۔

''مجھے کلکتہ میں ایک مرتبہ سید محمود آزاد سے ملنے کا اتفاق ہوا، اس وقت میری نوجوانی کا زمانہ تھا ۔لیکن وہ ضعیف العمری کو پہنچ چکے تھے۔ یہاں تک کہ ان کی بھنویں سفید ہوچکی تھیں۔ شہر کے ایک مشہور شاعر' قاضی عبد الحمید کے مکان میں تشریف فرما تھے۔ قصائد عرفی کی شعری خوبیوں کا تذکرہ تھا۔ وہ گاہے گاہے اس کے بند گنگناتے اور جھومتے جاتے تھے۔''

بنگال کے چند تذکرہ نگاروں نے سید محمود آزاد کے قیام کلکتہ کے بارے میں چند ایسی باتیں تحریر کی ہیں جن کا حقائق سے دور کا بھی رشتہ نظر نہیں آتا۔ ایسے لوگوں میں ''تجلیات شعرستان فارسی'' کے مصنف لطیف الرحمٰن بھی شامل ہیں۔ انھوں نے لکھا ہے کہ مرزا غالب جن دنوں اپنے پنشن کے سلسلے میں کلکتہ وارد ہوئے' سید محمود آزاد بھی یہاں موجود تھے ۔ دونوں کی ایک دوسرے سے ملاقات ہوئی تھی ۔لگتا ہے سید صاحب کو حکیم حبیب الرحمٰن کے اس جملے سے دھوکہ ہوا ہے جس میں انہوں نے لکھا ہے کہ ''جب غالب کلکتہ آئے تو آزاد یہیں

تھے۔ مرزا صاحب سے ملاقات کیا ہوئی کہ زندگی بھر انہیں کے ہو کر رہ گئے'' یہی نہیں بلکہ انہوں نے یہاں تک لکھا ہے کہ سید محمود آزاد مرزا غالبؔ سے مل کر اس قدر متاثر ہوئے کہ انھوں نے خود کو مرزا کا شاگرد کہلانا باعث فخر محسوس کیا۔ بلکہ تعلقات کے رشتے کچھ ایسے مستحکم ہوئے کی مرزا کی دہلی واپسی کے بعد بذریعہ خط وکتابت اصلاح شعروسخن کا سلسلہ جاری رہا۔ مرزا کی صحبت سے استفادہ کی غرض سے محمود آزاد ہر سال دہلی جاتے رہے اور کم از کم تین ماہ تک قیام پذیر ہوا کرتے۔ یہ تحقیق کی زبردست غلطی ہے۔

مرزا غالبؔ کی کلکتہ آمد اور یہاں سے واپسی کی تاریخ ڈھکی چھپی نہیں ہے۔ تاریخی اعتبار سے دونوں کی ملاقات کوئی حقیقت نہیں رکھتی اس لئے کہ محمود آزاد اس وقت تک دنیائے فانی میں تشریف نہیں لائے تھے۔ ان کی پیدائش غالبؔ کے کلکتے سے ۲۹ر نومبر ۱۸۲۹ء کو چلے جانے کے ۱۲ ر سال کے بعد ہوئی۔ غالبؔ اور آزاد کے درمیان استاد شاگرد کا رشتہ بھی بے معنی سی بات ہے۔ اگر اس طرح کوئی بات ہوتی تو محمود آزاد کے دیوان میں اس کے اشارے ضرور موجود ہوتے۔

محمود آزاد نے اپنے استادوں کا ذکر بھی کیا ہے۔ اصلاح شعروسخن میں آغا احمد علی احمد اور حفیظ اکرام الدین احمد ضیغم کا خاص طور پر ذکر کیا ہے۔ مگر مرزا غالب کے سلسلے میں انھوں نے کوئی بات نہیں کہی ہے البتہ محمود آزاد کے دیوان میں ایک شعر موجود ہے جس میں سرسری طور پر غالبؔ کا نام آجاتا ہے لیکن اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ غالبؔ سے ان کو شرف تلمذ حاصل تھا۔

مرزا غالب کے انتقال کے وقت محمود آزاد کی عمر تقریباً ۲۷ر سال تھی۔ ان کے دیوان میں مدحیہ انداز میں متعدد قطعہ تاریخ موجود ہیں جو انھوں نے اپنے سرپرستوں کے علاوہ دوست احباب کی موت پر کہے تھے۔ مگر غالبؔ کی موت سے متعلق کوئی قطعہ تاریخ موجود نہیں۔ یہ اس بات کا بین ثبوت ہے کہ آزاد کو غالب سے کچھ لینا دینا نہیں تھا۔

محمود آزاد کے غالب کا مداح ہونے کا کوئی سوال بھی پیدا نہیں ہوتا۔ اس لئے کہ شعر وسخن کی دنیا میں انکی رہنمائی کرنے والی مقتدر شخصیت آغا احمد علی بذات خود مرزا کے کٹر مخالف تھے۔ مالک رام نے بھی اپنی تصنیف ''تلامذۂ غالب'' میں محمود آزاد کو مرزا کا شاگرد تسلیم نہیں کیا ہے۔ ان تمام باتوں کے باوجود کلکتہ کے ایک نقاد شانتی رنجن بھٹا چاریہ کو اصرار ہے کہ مرزا غالب اور محمود آزاد کی ملاقات ہوئی تھی اور دونوں کے درمیان استاد اور شاگرد کا رشتہ قائم ہوگیا تھا۔ حالانکہ مرزا نے اپنے دور دراز کے شاگردوں کو بے شمار خطوط لکھے ہیں۔ ایسی صورت میں محمود آزاد کے نام بھی کوئی خط ضرور موجود ہوتا۔ پتہ نہیں شانتی رنجن بھٹا چاریہ جیسے سلجھے ہوئے محقق سے کیسے سہو ہوگیا۔

محمود آزاد کی مطبوعہ تصنیف میں صرف ان کا دیوان ہم تک پہنچا ہے جو ان کی زندگی ہی میں ۱۳۰۷ھ یا ۱۸۹۴ء میں عظیم آباد سے شائع ہوا تھا۔ دیوان میں اس زمانے کی ایک مشہور ادبی شخصیت عبد الغفور شہباز کا دیباچہ موجود ہے جس میں انتہائی بلند وبانگ انداز میں تعریف کے پل باندھے گئے ہیں۔ دیباچے میں شاعر یا ادیب کی بے جا مدح سرائی ایک روایت سی بن گئی تھی۔ خامیوں پر کم اور خوبیوں پر زیادہ توجہ دی جاتی تھی۔ دیوان محمود آزاد کا دیباچہ بھی اسی روایت کا شکار ہے۔ تنقیدی اعتبار سے اس دیباچے کی کوئی اہمیت نہیں۔

محمود آزاد کا دیوان دو حصوں میں منقسم ہے۔ حصہ اول فارسی کے لئے مخصوص ہے اور دوسرے میں کلام ریختہ کے عنوان سے اردو میں کہی گئی تیرہ غزلیں اور پانچ رباعیاں ہیں۔ فارسی کلام کے ذخیرے میں نو قصیدے، تیرہ غزلیں، تین مثنویاں، بائیس رباعیاں اور سولہ قطعات تاریخ موجود ہیں۔ دیوان کے اخیر میں مسدس آزاد کے عنوان سے ایک مسدس کو شامل کرلیا گیا ہے جس میں اکتیس بند ہیں۔

محمود آزاد نے تقریباً سبھی اصناف سخن پر طبع آزمائی کی ہے مگر ان کا خاص میدان قصیدہ ہے۔ ان کے دیوان کا تقریباً نصف حصہ قصائد سے بھرا پڑا ہے۔ قصیدے کی ابتداء

انھوں نے حمد اور نعت سے کی ہے۔ اس کے بعد مختلف شخصیتوں کی شان میں قصائد تحریر کیے ہیں۔ ان شخصیتوں میں چند نواب صاحبان بھی شامل ہیں جنھیں آزاد کی سرپرستی کا شرف حاصل ہے۔ مثلاً خواجہ عبد الغنی احسان اللہ خان بہادر اور کلب علی خان بہادر وغیرہ۔ مشہور شاعر عبد الغفور نساخ کی شان میں بھی ایک قصیدہ موجود ہے۔ آزاد نے ''معراج الخیال'' کے عنوان سے فارسی زبان کے مشہور قصیدہ کو خاقانی کے ایک مشہور قصیدہ:

دل من پیر تعلیم ست ومن طفل زبان دانش
دم تسلیم سر عشر وسر زانو دبستانش

کے انداز میں مدحت رسول پیش کی ہے جس کے چند اشعار درج ذیل ہیں:

دلم گلچین اسرار وخیال من گلستانش
فضای هر دوعالم گوشه ای از یک خیابانش
خوشا باغی که طبعش باغبان فکر ش صبا آمد
قلم گلدسته بند وصفحه قرطاس گلدانش
خوشا باغی که رشک خلد شد دامان آگاهی
زرنگین جلوه های دلکش گلهای الوانش
تعالیٰ الله چه باغیست این که ریزد گوهر مضمون
حبیب گوش عقل آواز مرغان خوش الحانش
تعالیٰ الله چه باغیست این که میخواران معنی را
... مستی جاوید آمد بوی ریحانش
زهی باغی که مانند تاقیامت تازه گلهایش
نه آن باغی که ره نبود در او باد خزانی را
چه در اردی چه در بهمن نه بینی تازه یکسانش
زهی باغی که نازک نکته ٔ هوش وخرد افزا

فزون از حصر منقوش است بر اوراق واعضا یش

اس قصیدے کے ایک حصے میں انھوں نے شہر ڈھاکہ کا بھی ذکر کیا ہے۔ ڈھاکہ کی خوب صورتی بیان کرنے میں انھوں نے کئی بند تحریر کیے ہیں۔ چونکہ اسکے ضمن میں انھوں نے کچھ اہم معلومات بھی فراہم کی ہیں۔ اس لئے اس قصیدے کی خاص اہمیت ہے۔

رضا علی وحشت نے آزاد کی غزل گوئی کو خوب سراہا ہے اور انتہائی معیاری غزلوں میں شمار کیا ہے۔ آزاد بذات خود کہتے رہے ہیں کہ ان کی غزلوں میں حافظ اور نظیری کا رنگ تغزل جھلکتا ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ ان میں ایسی کوئی بات نہیں۔ لطیف الرحمٰن نے ان غزلوں کو کمتر درجے کی شاعری قرار دیا ہے اور یوں ہی سرسری طور پر کہے گئے کلام میں شمار کیا ہے۔ محمود آزاد کی غزلیں جوش بیان کی قوت سے عاری ہیں۔ ان پر تصنع کا گمان ہوتا ہے۔ ایک غزل کا شعر اس طرح ہے۔

ھجوم درد مندان برسر خاک من است امشب

چراغ تربتم از سوز دلھا روشن است امشب

حالانکہ محمود آزاد نے خود کو قصیدہ کو شاعر کی حیثیت سے متعارف کرانے کی کوشش کی ہے۔ تخیلات اور مضمون آفرینی کے میدان میں خاقانی تک دوڑ لگائی ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ ان کی شاعری کے جوہر قصائد اور غزلوں میں نہیں مثنویوں میں کھلتے ہیں۔ آزاد کے نقادوں کی نظر میں مثنوی بحیثیت صنف سخن کوئی خاص اہمیت نہ رکھتی ہو۔ مگر آزاد نے مثنویوں میں جو لہجہ اختیار کیا ہے، وہ سو فیصدی داخلی ہے۔ اس میں مضمون نگاری کے مصنوعی پہلوؤں کا عمل دخل نہیں ملتا۔

محمود آزاد کی ایک مثنوی " روداد طوفان آفت نشان ڈھاکہ" ۴۹ اشعار پر مشتمل ہے۔ اس مثنوی میں انھوں نے ایک سمندری طوفان کا ذکر کیا ہے جس کی ہلاکت خیزیوں کی زد میں آکر پورا شہر اور قرب وجوار کے علاقے تباہ وبرباد ہوگئے۔ طوفان کچھ اس قدر طاقتور

تھا کہ بلند اور تناور درخت گھاس کے تنکوں کی طرح ہوا میں اڑ گئے۔ گھر اور جھونپڑیاں لاپتہ ہوگئیں۔ رؤسا کے مکانات اور عمارتیں اینٹوں کے ڈھیر میں تبدیل ہوگئیں۔ محمود آزاد نے طوفان کی آمد اور اس کی تباہ کاریوں کی ایسی منظر کشی کی ہے جسے پڑھ کر اذیت ناک حالات زندہ جاوید صورت میں سامنے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ واقعات بیان کرنے میں انھوں نے جو تشبیہیں استعمال کی ہیں، وہ نہ صرف دل و دماغ میں اترنے کی قوت رکھتی ہیں بلکہ قاری بھی شاعری کی داخلی کیفیات میں برابر کا شریک ہوجاتا ہے۔ مثنوی کے چند اشعار یوں ہیں:

زمغرب یکی فیل مست سحاب
ز خرطوم آتش فشان جای آب

تا

بسا مردمان و وحوش و طیور
بکشت وبجست و بافگند دور

اور

هوای که کرد از دم فتنه زا
بدریا و ساحل قیامت بپا

تا

فروریخت از صدمه اش ناگهان
نماند ز دیوار و سقفش نشان

محمود آزاد نے اس مثنوی میں جس خوفناک طوفان کا ذکر کیا ہے، اس کی تاریخی حیثیت ہے اور اسے ۱۹/ ویں صدی کی بھیانک تباہ کاریوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ اس زمانے میں ڈھاکہ شہر کی آبادی مختصر تھی۔ سرکاری ریکارڈ میں درج کردہ تفصیلات کے مطابق یہ طوفان ۷/ اپریل ۱۸۸۸ء میں آیا۔ ۳۵۲۷ مکانات کے نام ونشان مٹ گئے۔ ۱۳۰ لاشیں برآمد

ہوئیں۔تقریباً ڈیڑھ ہزار افراد زخمی ہوئے۔ساحل سمندر پر ۲۱ کشتیاں چکنا چور ہوگئیں۔ محمود آزاد نے اپنی مثنوی میں بھیانک طوفان کا ڈرامائی منظر دل کو چھو لینے والے انداز میں پیش کیا ہے۔ یہ طوفان سنیچر کے دن آیا تھا۔لگ بھگ سہ پہر کے قریب آسمان اچانک ابر آلود ہوگیا اور شدید بارش ہونے لگی جس کا سلسلہ غروب آفتاب تک جاری رہا۔ اس کے بعد آسمان بالکل صاف ہوگیا۔لیکن تھوڑی دیر بعد انتہائی خوفناک شکل کے سیاہ بادل آسمان پر منڈلانے لگے۔ اس کے بعد وہ تباہ کاریاں ہوئیں جیسے بیان کرنے میں آزاد کا قلم بذات خود چشم گریہ بن گیا۔

مثنوی کے ابتدائی دو اشعار میں آزاد نے طوفان آنے کی تاریخ بھی تحریر کی ہے:

در این روزگار بلا سر گذشت
که بر هیجده هست هشتادوهشت
بتاریخ هفتم ، ز اپریل لے ماه
شده ڈهلکه و اهل ڈهاکه تباه

عبیدی محمود آزاد کی مثنوی نگاری کے فن کو خوب سراہتے تھے۔تقریظ مثنوی ذو البحرین کے عنوان سے انہوں نے آزاد کی مثنوی کی تعریف میں جو قطعہ لکھا ہے۔ اس کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

در دو بحر این مثنوی بنگاشته
بحر معنی اندر او هر سو روان
رشک ارتنگ ست این سردار ...
مانی معنی ست این جادو بیان
سال رنگ آمیزش چون خواستم
از قریحت کوست پیر نکته دان

گفت او از هجرت خیر الوریٰ
حجت فخر آمد این جادو نشان
(۱۲۷۲ھ)

محمود آزاد کی مسدس نگاری بھی کچھ کم نہیں۔مثنوی کے بعد ان کے دل ودماغ کی جولانیاں مسدس میں نظر آتی ہیں۔مسدس کا ہر بند مکمل تصویر ہے۔مسدس میں ایسے مضامین لائے گئے ہیں کہ ان پر شاعر فطرت ہونے کا گمان ہوتا ہے۔جہاں تک فطری پہلوؤں کا تعلق ہے، اس میں بھی انھوں نے ایک الگ سنجیدہ راہ اختیار کی ہے۔کائنات کا تجزیہ کرنے لگتے ہیں تو کوئی بھی پہلو نہیں چھوڑتے اور انجام دنیا کے دروازے پر لاکر کھڑا کرتے ہیں۔آزاد کو مشاہدہ قدرت میں انسانی زندگی کی مماثلت نظر آئی۔اس لئے وہ بے اختیار کہنے پر مجبور ہیں کہ ہر رنگ کا انجام بیرنگی ہے، ہر خوشی کا اختتام رنج وغم ہے اور شور وغل کا نتیجہ سکوت ہے۔

ان کے مسدس کے چند بند مزاج میں کچھ عجیب طرح حرارت پیدا کرتے ہیں۔

ملاحظہ ہو:

زسبزه سبزه سر بسر فضای کوهسار بین
میان سبزه جابجا شگفته لاله زار بین
پرنده های گوهرین ز جوش آبشار بین
به دوشهای نازک عرائس بهار بین
به زیر آبشار ها شگفته لاله زار ها
عجب که مشتعل شده در آب شراره ها
نشسته در نواگری فراز شاخسار ها
وپاشگفته غنچه ها فراز شاخسار ها
ز ... دستا ربوده دل ترنم هزار ها

به هر درخت نغمه زن طا یران هزار ها

تا

نه فکر آب ودانه ها نه یاد آشیانه ها

به بزم طبع شورها فگنده از ترانه ها

بنگال کے انیسویں صدی کے فارسی کو شعراء میں محمود آزاد کا مقام سب سے نمایاں ہے۔ انھوں نے ایک فنکار کی سی زندگی بسر کی اور مجلس شعروسخن میں شمع کی طرح روشن رہے۔ سماجی حیثیت سے یوں تو رئیس زادے تھے مگر قدرتی حالات نے تنگ دستی وعسرت میں زندگی بسر کرنے پر مجبور کردیا تھا۔فطری ذہانت ،قوت مشاہدہ اور احساسات نے رنج وغم کی آنچ میں پختگی پائی جوشعروسخن کے میدان میں زبردست قوت اور حرارت بن کر ظاہر ہوئی۔

حوالہ:

ا۔فارسی زبان میں اپریل نہیں بلکہ آوریل درست ہے۔

☆☆☆☆

ڈاکٹر سید صادق گوہرین

ایران کا
چوتھی صدی ہجری کا علمی ماحول

مختلف علوم وفنون اور اصناف ادب کے وجود میں آنے کے اعتبار سے چوتھی صدی ہجری اسلامی تمدن کا درخشاں ترین دور شمار ہوتا ہے۔ اس لئے کہ ماضی کے علماء وفضلاء نے علوم وفنون کے جو پودے لگائے تھے وہ اس صدی میں تناور درخت میں تبدیل ہو چکے تھے اور ان کی شاخیں اسلامی مملکتوں کے اکثر وبیشتر علاقوں پر سایہ فگن ہو چکی تھیں۔

علم ومعرفت کے اعتبار سے اس صدی میں، جو یقیناً پوری اسلامی تاریخ میں اپنی نظیر نہیں رکھتی، لاکھوں عالم، دانشور، فلسفی، حکیم، ادیب اور شاعر وسیع وعریض اسلامی مملکت میں زندگی گذار رہے تھے۔ اس وسیع اسلامی مملکت کے ہر گوشے میں جو اسپین سے دیوار چین تک پھیلی ہوئی تھی۔ ایسے علما اور دانشور موجود تھے جنہیں اپنے عہد کے مختلف علوم وفنون پر نہ صرف عبور حاصل تھا بلکہ وہ اپنے عہد کے بزرگان علم میں شمار کیے جاتے تھے۔ اس کے علاوہ یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ اس صدی کے بعد ان مملکتوں میں ایسے بے نظیر علماء ودانشور پیدا نہیں ہوئے۔ خراسان اور ماوراء النہر بھی اس عظیم دولت سے محروم نہیں تھے بلکہ ان کے ہر گوشہ وکنار میں ''ابوالخیر خمار'' ابو ریحان بیرونی'' اور ''ابو علی سینا'' جیسے بڑے حکما موجود تھے اور یقیناً ان کا اسلامی علوم وثقافت کی تاریخ میں کوئی ثانی نظر نہیں آتا۔

بیشتر معلومات کے لئے نامناسب نہ ہوگا کہ اس صدی کے علمی ماحول کا گذشتہ

صدیوں سے ایک سرسری موازنہ کرلیا جائے تا کہ اس صدی میں علمی مکاتب اور ابوعلی سینا اور ان جیسے دوسرے علماء وفضلا کے وجود میں آنے کے اسباب وعلل بہتر طور پر سمجھے جاسکیں۔

جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ کوئی عالم یا دانشور اچانک یا آناً فاناً وجود میں نہیں آجاتا بلکہ اس کا وجود میں آنا ان اسباب اور حالات پر منحصر ہوتا ہے جن پر غوروفکر کئے بغیر اس کی دانشوری ، اور درایت اور علم کی سطح میزان معلوم نہیں ہوسکی۔ لہٰذا ہم ابوعلی سینا کے عہد کے متداول علوم کی کیفیت اور ان علوم سے ان کے فائدہ اٹھانے کے طریقۂ کار کے بارے میں بیشتر معلومات کے لئے ان سے پہلے کے ادوار کی جانب مختصر اشارہ کرتے ہیں۔ البتہ اس نکتے پر توجہ دینا چاہیے کہ اسلام کی ابتدائی صدیوں میں علوم عقلی ونقلی کی کیفیت اور گزشتہ صدیوں سے چوتھی صدی تک کے مشہور علمی مکاتیب کی تفصیل بیان کرنے کا مقصد ان علوم ومکاتیب کی جزئیات میں جانا نہیں ہے بلکہ نہایت اختصار سے ان اہم باتوں کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے جو ابوعلی سینا کے عہد کے ثقافتی حالات کی شناخت میں ہمارے معاون ہوں گا۔

جزیرۃ العرب کے باشندے جن کے درمیان اسلام کا ظہور ہوا اور جن کے وسیلے سے وہ اطراف کے ملکوں میں سرایت کرتا گیا نیز نہایت کم عرصے میں جنہوں نے سیاسی اعتبار سے وسیع اسلامی شہنشاہیت تشکیل دی، ایسے لوگ تھے جو علم ومعرفت سے بالکل بے بہرہ تھے۔ دور جاہلیت کے عرب بقول جاحظ: تمدن ومدنیت سے بہت دور تھے۔ نہ تو وہ تجارت کرتے تھے اور نہ ان کے پاس کوئی صنعت تھی اور نہ ہی کھیتی باڑی۔ ان کے پاس نہ تو کوئی حکیم تھا اور نہ ہی حساب کتاب انہیں آتا تھا۔ اور جو کچھ انہوں نے بعد میں تمدن اور مدنیت کے ذریعے حاصل کیا وہ ساسانیوں، قیصر روم اور ان دیگر قوم وملل کا حاصل کردہ تھا جنہوں نے ان پر حکومت کی تھی۔ اور بقول محمد جریر طبری:

"عرب کے یہ زندہ لوگ یا ملت زندۂ عرب دراصل ایسے لوگ تھے جنکو خدا کی ذلیل ترین مخلوق شمار کیا جاتا تھا اور جو نہایت پستی میں زندگی بسر کررہے تھے۔ گمراہ اور تاریک ترین

راہوں میں ننگے بھوکے بھٹک رہے تھے اور ہمیشہ دو بڑی اور متمدن حکومتوں، روم و ایران کے دباؤ میں جی رہے تھے اور ان ہی کی سرپرستی میں زندگی گذار رہے تھے۔ اور چونکہ ان کے اپنے وطن میں کوئی ایسی قابل ذکر چیز نہیں پائی جاتی ہے اس لئے ان دونوں مملکتوں کے حملوں سے بھی محفوظ تھے۔ وہ بڑی بری حالت میں زندگی بسر کرتے تھے۔ کہا جاسکتا ہے کہ وہ ٹوٹ اور بکھر رہے تھے انہیں کھانے پینے تک کی کوئی چیز میسر نہیں تھی۔ یہاں تک کہ خداوند عزوجل نے ان پر رحمت نازل کی اور اسلام کا وہاں ظہور ہوا۔ کتاب وسنت سے آگاہ ہوئے اور اس طرح اسلام کے پرتو میں جہاد ان پر فرض ہوا۔ وہ اطراف کے ممالک کی طرف بڑھے اور خدائی امداد اورقرآن سے روشنی حاصل کرکے دنیا کے ملکوں کو فتح کیا اور پورے عالم پر حکمرانی کی۔"[1]

دور جاہلیت کے عربوں کی سیاسی اور اقتصادی حالت کی طرف جاحظ اور طبری نے اشارہ کیا ہے۔ عقلی لحاظ سے بھی یہ لوگ نہایت وحشی پن اور بربریت میں زندگی بسر کرتے تھے۔ ان کا علم، خرافات، کہاوتوں افسانوں، حکایتوں، قصوں اور انساب کی حد تک محدود تھا۔ وہ طب و فلسفہ اور دیگر علوم سے بالکل بے بہرہ تھے اور ان کے "دانشمندوں" نے خرافات، جہالت، منافرت اور احمقانہ فخر ومباہات میں اپنی زندگیاں گذار دی تھیں، مجموعی طور پر اس جلتی سرزمین کے باشندے خرافات، نادانی و بے خبری کے دلدل میں ہاتھ پیر مار رہے تھے جس کی تفصیل اس قوم کی سیاسی اور اقتصادی تاریخ میں ملاحظہ کی جاسکتی ہے۔ یہاں تک کہ دین مبین اسلام کا ظہور ہوا اور تاریخی روایت کے مطابق جس کی علت بھی اس قوم کی اقتصادی تاریخ میں دیکھی جاسکتی ہے، اس خدائی دین کے احکام کے ذریعے انہوں نے مختلف اقوام وملل اور ممالک پر تسلط حاصل کیا۔

جوں ہی عربوں نے عربستان سے باہر قدم رکھا ان کی عقلی حالت دگرگوں ہوگئی کیوں کہ انہوں نے بہت جلد کرۂ زمین کا ایک حصہ جو تقریباً چین اور موجودہ فرانس تک پھیلا ہوا تھا، حاصل کرلیا، اس وسیع علاقے کے لوگوں سے ان کے تعلقات استوار ہوئے جو ثقافتی لحاظ سے عربوں سے بھی ہزاروں سال آگے تھے۔ انہوں نے ان کے عقلی اور نقلی آثار سے فائدہ اٹھایا

خاص کر اس لئے بھی کہ عربوں نے اس زمانے کے متمدن ترین علاقے روم وایران پر تسلط حاصل کرلیا اور مذکورہ دونوں عظیم ملکوں کی تہذیب وثقافت کے عظیم ذخائر سے سیراب ہوئے۔

عربوں نے اسلامی ملکوں کے متمدن باشندوں کے ساتھ رہ کر نہ صرف خود کو غنی کیا بلکہ وہ اپنے زیر نگین تمام ممالک اور مختلف اقوام وملل کو پرچم اسلام کے زیر سایہ کرکے ایک عظیم اور حیرت انگیز تمدن وثقافت وجود میں لانے میں کامیاب ہوئے جسے ہم آج اسلامی تمدن وثقافت کہتے ہیں۔ یہ تمدن وثقافت جو اپنی حد تک یقیناً روم وایران ومصر کی ثقافت سے عظیم تھی، صدیوں باقی رہی اور اس نے دنیائے علم وادب کو علماء ودانشور دیئے جن کے زیر سایہ تمدن کا قافلہ دور دراز اور طولانی راستہ طے کرسکا اور دنیا کے ایک حصہ کو قرون وسطی کی بربریت اور وحشی پن سے نجات حاصل ہوگئی۔

ممالک اسلامیہ کی مختلف النوع اقوام طرز زندگی، اقتصاد، سیاست، معاشرتی تشکل، مملکت ومذہب کی صورتحال کے اعتبار سے اور سوجھ بوجھ کے لحاظ سے ایک دوسرے سے مختلف تھیں۔ اسلام کی پہلی صدی میں، چونکہ ابھی ان مختلف اقوام وملل کا اختلاط وامتزاج فتوحات اسلامی کی وجہ سے شروع نہیں ہوا تھا، ہر ایک قوم اپنے قدیمی تمدن پر فخر کرتی تھی اور اپنے ماضی کی ثقافت کو گلے سے لگائے ہوئی تھی۔ لیکن خلافت بنی عباس کے آغاز میں ہی وہ تمام اختلاف وامتیازات ختم ہوگئے اور وہ تمام ممالک ومختلف اقوام ایک حکومت کے تحت آگئے جو حکومت اسلامی ممالک کے نام سے جانی جاتی تھی اس اتحاد کا سبب وسیع وعریض اسلامی ممالک کے باشندوں کا ایک دوسرے کے درمیان آپسی میل جول تھا۔ وہ چاہے اقتصادی لحاظ سے ہو یا سیاسی اعتبار سے یہ اختلاط اجباری تھا اور ان وسیع ممالک کے باشندے خواہ مخواہ ایک دوسرے سے بیشتر تعلقات بڑھانے پر مجبور تھے۔ عباسیوں کے عہد تک عرب اور غیر عرب کے درمیان شادی بیاہ تقریباً ممنوع تھا اور اگرچہ کوئی قانونی پابندی نہیں تھی تاہم اس قسم کی شادیاں عربوں کے لیے چندان خوش آئندہ نہیں تھیں۔ جبکہ اسلام نسلی برتری کا قائل نہیں ہے۔ اور انسان پر انسان

کی برتری کا انحصار تقویٰ اور پرہیزگاری کو جانتا ہے لیکن بعض وجوہ کی بناپر بنی امیہ غیر عرب سے راہ ورسم نہیں رکھتے تھے۔ غیر عرب کی لڑکیوں سے شادی نہیں کرتے تھے اور جن کے ماں باپ غیر عرب تھے انہیں حقیر سمجھتے تھے اور ان کو ”ہجین“ کہتے تھے۔ عربوں میں اس زمانے میں اس لفظ کا اطلاق ان پر ہوتا تھا جن کی مائیں غیر عرب تھیں۔ یہ لفظ تقریباً ایک طرح کے دشنام کا مترادف تھا۔ امویوں نے بھی اس بات کی کوشش کی کہ مختلف علاقوں کے حکمرانوں کے انتخاب میں ایسے لوگ شامل نہ ہوں۔

انہوں نے اس کی بھی کوشش کی کہ موالی یعنی غیر عرب، کبھی بھی عرب عورتوں سے شادی نہ کرسکیں چنانچہ ایک موالی نے قبیلۂ بنی سلیم میں شادی کی اور جب محمد بن بشر خارجی نے معاملے کو سمجھ لیا تو اس نے اس وقت کے حاکم مدینہ ابراہیم بن ہشام بن اسمٰعیل سے شکایت کی۔ حاکم نے حکم دیا کہ وہ موالی لایا جائے۔ اس کی بیوی کو اس سے الگ کردیا گیا اور اسے سوتازیانے لگائے گئے نیز اس کی داڑھی اور سر کے بال مونڈ دیے گئے۔[۲۷]

اس قسم کی روایات جو عربوں کے غیر عرب کے ساتھ امتیاز کی مظہر ہیں۔ قدیم کتابوں میں کثرت سے ملتی ہیں۔ لیکن اس نکتے کی جانب بھی اشارہ ضروری ہے کہ خاندان بنی ہاشم ایسی خرافات سے الگ تھلگ تھا۔ وہ تمام مسلمانوں کو بھائی سمجھتا تھا اور ان سے راہ ورسم رکھتا تھا۔ علی ابن ابی طالب نے کبھی بھی کسی کو کسی پر برتر نہیں سمجھا اور عرب وعجم کو بھی ایک دوسرے پر ممتاز نہیں کیا۔ وہ عرب قبائل کے امراء روسا کو موقع ومحل کے لحاظ سے قابل احترام سمجھتے تھے اور عربوں کی ان سے روگردانی کی یہ خود ایک بڑی وجہ تھی۔[۲۸] امام حسین علیہ السلام نے غیر عرب میں شادی کی اور اس خاتون سے آپ کے یہاں ایک فرزند متولد ہوا جس کا نام ”زین العابدینؑ“ رکھا گیا جو شیعوں کے چوتھے امام ہیں۔ لیکن خاندان بنی امیہ اور دیگر عرب قبائل (اس معاملے میں) سخت تعصب سے کام لیتے تھے اور برسہابرس انہوں نے نہ تو غیر عرب سے کوئی اختلاط وآمیزش کا سلسلہ رکھا اور نہ ہی غیر عرب سے شادی بیاہ کیا۔

چونکہ عرب وعجم کا یہ عدم اختلاط فطری نہیں تھا اسلئے دیر پا ثابت نہیں ہوا۔ ۴ اور پہلی صدی کے اواخر نیز دوسری صدی کے اوائل سے عرب وغیر عرب کے درمیان اختلاط وآمیزش کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ چنانچہ ولید بن عبد الملک شاہ اسپرم نے فیروز ابن یزدگرد شہر یار کی بیٹی سے شادی کی۔ اس سے اسے دو بیٹے ہوئے اور دونوں ہی یزید وابراہیم کے نام سے خلیفہ ہوئے۔ ۵ مروان بن محمد کی والدہ کردستان کی رہنے والی تھی۔ ۶

اس امتزاج وآمیزش میں عباسی دربار نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا کیوں کہ انہیں اپنے لہو ولعب کی محفلوں کے لئے کنیزوں کی سخت ضرورت تھی اور یہ کنیزیں خلفا اور بزرگان عباسی کی ہمسری کے رتبہ تک پہونچ جاتیں چنانچہ اکثر عباسی خلفا اور شہزادوں کی مائیں غیر عرب تھیں۔ ہارون رشید کے پاس گانے بجانے اور ساقی کا کام کرنے والی ہزاروں کنیزیں تھیں جو مختلف اقوام سے تعلق رکھتی تھیں اور دربار خلافت میں جمع ہوئی تھیں۔ ۷

ان کنیزوں نے عرب وعجم کے میل جول میں بڑا اہم کردار ادا کیا اور اس زمانہ کے خلفا اور شہزادوں اور امرا نے کنیزوں کے سلسلے میں خاص دلچسپی دکھائی اور اکثر عباسی خلفاء شہزادے اور اس خاندان کے امرا اسی اختلاط کا نتیجہ تھے۔

ابو جعفر منصور خلیفۂ دوم عباسی کی ماں سلامۂ بربری تھی۔ مامون کی ماں، مراجل، اور معتصم وواثق ومتوکل کی والدہ غیر عرب کنیزیں تھیں۔ خلیفۂ عباسی مہدی کے بیٹوں کی ماں کا نام 'خیزران' تھا جو خرشنہ کی رہنے والی تھی۔ خرشنہ، ملطیہ کے قریب واقع ایک شہر تھا۔ ۹

عرب وعجم کا اختلاط دوسری صدی ہجری سے شروع ہوا اور کچھ ایسا رائج ہوا کہ عربستان کے ان شہروں میں بھی جہاں قدیم روایات کے مطابق غیر عرب سے معاشرت سے پرہیز کیا جاتا تھا، فقہا اور دانشوروں کے فتووں کی بدولت غیر عرب سے معاشرت کی جانب رغبت پیدا ہوئی۔ صاحب عقد الفرید نے اصمعی سے روایت کی ہے کہ اکثر اہل مدینہ غیر عرب عورتوں سے اختلاط سے پرہیز کرتے تھے اور ان سے معاشرت کو اچھا نہیں سمجھتے تھے۔

یہاں تک کہ علی بن حسین (ع) قاسم بن محمد اور سالم بن عبد اللہ نے جو اس وقت کے معروف فقہا میں تھے، اس کا فتوا صادر کیا اور خود انہوں نے اس کام میں پیش قدمی کی اور دیگر اہالیان شہر نے بھی ان کی پیروی کی اور غیر عرب کنیزوں سے اختلاط پیدا کیا۔ ۱۰؎

یہ اختلاط اور میل جول اس قدر بڑھ گیا کہ بہت کم عرصے میں پورے اسلامی ممالک میں ایسا کوئی گروہ یا طبقہ دیکھنے میں نہیں آتا جن کے والدین ایک نسل سے ہوں۔ اس اختلاط وآمیزش سے ایک نئی نسل وجود میں آئی جو نہ عرب تھی اور نہ اس زمانے کی اصطلاح میں عجم تھی اور اس نسل نے جو عربوں کا دیگر اقوام عالم سے اختلاط کا نتیجہ تھی، ایک امت واحدہ کی تشکیل کی جسے ملت اسلامیہ کہنا چاہئے۔ اس نے ایک ایسے تمدن کی بنیاد ڈالی جسے سیاسی، اقتصادی اورسماجی تاریخ میں، اسلامی تمدن کہا جاتا ہے۔

گوناگوں اسلامی اقوام نے جس طرح اختلاط وآمیزش سے ایک امت کی تشکیل کی اسی طرح بچگانہ ونسل پرستانہ تصورات سے بھی رہائی حاصل کی۔ عقل وفکر کے اعتبار سے بھی ان میں اچانک اہم تبدیلیاں رونما ہوئیں اور مختلف اقوام کے ایک دوسرے سے ملنے جلنے کے بعد ان میں ایسے نئے افکار ومعانی وجود میں آئے جس کی مثال نہیں ملتی۔ یونانی، رومی، ایرانی، مصری، مراکشی، اسپینی اور عرب وغیرہ مختلف مذاہب مثلاً عیسائی، یہودی، زرتشتی اور اسلام کے ماننے والے ہونے کے باوجود ایک دوسرے سے قریب ہوئے اور معاشرت ومخالطت کے نتیجے میں ایک دوسرے کے آراء وعقائد کے بارے میں مفید معلومات حاصل کیں اور ان ملل ومذاہب سے تبادلۂ خیالات نے فطری طور پر ایک نئے عقیدے کی نشوونما کی جس کی مثال نہیں۔ اس بنا پر دنیا میں ان کے یادگار اثرات باقی رہ گئے جو کاروانِ تمدن بشر کے نقطہ نگاہ سے بہت عظیم، گراں قدر اور قابل غور ہے اور اس قابل ہے کہ بلند پایہ علما، ودانشور اپنے عہد کو اس راستے پر ڈال دیں اور اس کے عظیم ثمرات سے اپنے عہد کی نسل کو آگاہ کریں۔

مختصر یہ کہ اسلام نے جس طرح مختلف ممالک کی اقوام کو جنہیں اپنی سرپرستی میں لیا

تھا، یکسر بدل کر رکھ دیا اسی طرح ان کے افکار ونظریات اور جذبات واحساسات پر بھی زبردست اثرات مرتب کئے۔ ساتھ ہی ان کے طرز فکر کی سمت بھی بدل ڈالی۔

ظاہر ہے ان تمام تغیر وتبدل سے جس قوم کو سب سے زیادہ فائدہ پہنچا وہ عرب قوم تھی جو عہد جاہلیت میں علم ومعرفت سے یکسر بے بہرہ تھی اور تمدن کے اعتبار سے پست ترین زندگی بسر کررہی تھی۔ اس میں شک نہیں کہ علمائے مصر وایران، روم واندلس اور دیگر ملت اسلامیہ سے تعلق رکھتے تھے جنہوں نے نہ صرف علوم اسلامی کی بنا ڈالی بلکہ انہیں اپنے علم ودانش کے ذریعے اتنا مستحکم بنادیا کہ وہ روئے زمین کے عظیم میدان میں صدیوں لوگوں پر حکومت کرسکے۔

اسلام کی ابتدائی صدیوں میں علوم کی راہ:

یہاں مذکورہ عنوان کے تحت بحث کا یہ مطلب نہیں کہ ماضی کی تمام صدیوں کے علمی حالات کا مکمل جائزہ پیش کیا جائے بلکہ مقصد علوم اسلامی کی تاریخ کی طرف اشارہ کرنا ہے جو بوعلی سینا او ان جیسے دیگر علما کے وجود میں آنے کا سبب بنی ہے۔ لہٰذا اس موضوع سے راقم سطور کا مقصد عہد اسلامی کے علمی امور کی جذئیات بیان کرنا نہیں ہے۔ اسی حد تک اکتفا کیا جائے گا جس سے ہم اپنے موضوع سے قریب تر رہیں۔

جیسا کہ عرض کیا گیا کہ جاہل عرب کسی قسم کے قابل ذکر تمدن کے حامل نہیں تھے۔ اسلام نے اپنے ظہور کے آغاز میں صرف روشن خیالی کے سوا عرب ثقافت میں کسی اور چیز کا اضافہ نہیں کیا تھا اور اسی بنا پر مفتوحہ ممالک میں ظہور اسلام کے اوائل میں علم ومعرفت کے لحاظ سے کوئی نئی چیز دیکھنے میں نہیں آئی۔ کیونکہ مسلسل جنگوں کی وجہ سے ترقی کے کاموں کے مواقع نہیں ملتے تھے اور دوسری بات یہ کہ مفتوحہ ممالک اور شہروں کے لوگوں میں میل جول نہ ہونے کی وجہ سے اسلامی ثقافت کے نام سے کوئی نئی ثقافت ابھی وجود میں نہیں آپائی تھی۔ پہلی صدی ہجری جنگ وجدال، ملکوں کو فتح کرنے اور خلافت کے موضوع پر مسلمانوں میں اندرونی

کشاکش اور اس جیسی دیگر چیزوں کی نذر ہوگئی تھی۔ اور علم ومعرفت کے ظہور کا کوئی مقام باقی نہیں رہ گیا تھا۔

مسلمان جس شہر میں بھی داخل ہوتے تھے لوگوں کی نئے دین کی جانب دعوت دیتے تھے اور پیغمبرؐ کے اصحاب، جو فاتح لشکر کے ساتھ شہروں میں داخل ہوتے تھے، تو لوگوں کو اسلام کے احکام، اصول فروع اور مناسک وغیرہ سے آگاہ کرتے تھے۔ غالباً خود بھی یہ اصحاب لکھنا پڑھنا نہیں جانتے تھے اور ان لوگوں نے اپنی پوری عمر میں کوئی کتاب بھی نہیں پڑھی تھی۔ لیکن رسول اکرمؐ کی صحبت میں بیٹھنے کی وجہ سے قرآن کریم یاد کرلیا تھا اور اصول فروع واحکام دین سے بھی بخوبی واقف تھے اور مختلف ممالک کے لوگوں کو اس کی تعلیم دیتے تھے۔عرب کی مغلوب اقوام بھی چونکہ نئے دین سے بے خبر تھیں اس لئے جو کچھ انہیں بتایا جاتا اسے ہی کافی سمجھتی تھیں۔ کیوں کہ جن عوامل کا ذکر کیا گیا ان کے پیش نظر انہیں نئے دین کے بارے میں غور وفکر کی فرصت نہیں تھی۔ خلفائے راشدین بھی، جو پیغمبرؐ کے سچے ساتھی تھے اور دوران جاہلیت میں ایک عمر بسر کر چکے تھے، اطراف کے متمدن ممالک مثلاً روم وایران ومصر کے گراں بہا علوم وفنون سے واقف نہیں تھے۔ اسی لئے جب عمر بن عاص نے اسکندریہ کو فتح کیا تو خلیفۂ دوم حضرت عمر سے پوچھا کہ کتابخانۂ اسکندریہ کا کیا کیا جائے؟ انہوں نے جواب دیا کہ ہمارے لئے صرف کتاب خدا کافی ہے۔یعنی قرآن کریم ہمیں دنیا کی تمام کتابوں سے مستغنی کردیتا ہے۔[۱۱]

بنی امیہ کو بھی اس خاندان کے ابتدائی خلفاء کی اپنے مخالفین کے ساتھ کشمکشوں، ان کی احمقانہ نسل پرستی اور تعصب اور ان میں سے اکثر کا لہو ولعب میں بسر کرنے کی وجہ سے مفتوحہ اسلامی ممالک کے علم وادب اور تمدن وثقافت کے عظیم اور بیش قیمت خزانے سے فائدہ اٹھانے کا موقع نہیں ملا۔ ان ملکوں کے عوام بھی مذکورہ جابر خاندان کی حکومت کے اہل کاروں سے مقابلے میں ہمہ تن مصروف تھے لہذا اس خاندان کے عہد اقتدار میں علم ومعرفت میں

چنداں ترقی نہیں ہوئی اور کسی کو علوم وفنون کے بارے میں غور وفکر کرنے کا موقع نہیں ملا۔

ان تمام باتوں کے باوجود خلفائے بنی امیہ نے اطبا کی اشد ضرورت کے پیش نظر مدرسہ اسکندریہ، جندی شاپور کالج اور دیگر بلند پایہ طبیبوں سے فائدے اٹھائے۔ ابن اصیبعہ نے کئی بڑے ایرانی اور مصری حکیموں کے نام گنوائے ہیں جن سے اموی خلفا نے فائدہ اٹھایا تھا اور اس عہد میں رائج نسلی فخر ومباہات کی وجہ سے شاعری اور خطابت نے بہت ترقی کی۔ نتیجے میں عظیم شعرا اور فصیح وبلیغ خطباء پیدا ہوئے جن کا کام عرب یا عجم قوم پر فخر ومباہات کرنا، یا ایک دوسرے کو برتر بتانا تھا اور چونکہ خلفا کو محرروں کی ضرورت تھی اس لئے اس دور میں بلند پایہ منشی اور قلم کار پیدا ہوئے جن کا تفصیلی ذکر ہمارے موضوع سے خارج ہے۔

ان تمام حالات کے باوجود اس دور میں علوم اسلامی کے ظہور میں آنے کی بنیاد ڈال دی گئیں۔ عصر اسلامی میں جس پہلے شخص نے تاریخ کی طرف توجہ دی وہ معاویہ ابن ابوسفیان تھا جس نے عبید بن شریہ الجرہمی کو موقع دیا اور اس سے پہلے عرب کے حالات پوچھے اور اس نے جوابات دیے۔ معاویہ نے حکم دیا کہ ان تمام روایات کو جمع کیا جائے لہذا دو کتابیں جمع ہوگئیں۔ ایک کتاب الامثال جس میں پچاس ورق تھے اور دوسری کتاب اخبار الماضیین ۱۲ جو کئی جزوں پر مشتمل تھی۔ زیور وجود سے آراستہ ہوئیں اگر یہ روایت صحیح ہے تو معاویہ کا یہ عمل بظاہر پہلا علمی کام ہے جو تاریخ اسلام میں انجام پایا۔

اموی خلفا کے حالات کے مطالعے کے دوران یزید بن معاویہ کے بیٹے خالد پر ہماری نظر ٹھہرتی ہے جو طب اور کیمیا کے بارے میں معلومات رکھتا تھا اور جس نے دونوں فن ایک راہب سے سیکھے تھے۔ اس شخص کو مذکورہ علوم کے بارے میں معلومات رکھنے کی وجہ سے ''حکیم آل مروان'' کہا گیا ہے۔ ۱۳ مجموعی طور پر وہ عالم، فاضل اور علم دوست شخص تھا اور علماء وفضلا کا احترام کرتا تھا۔ اس کے بارے میں کہتے ہیں کہ اس نے یونان کے کچھ فلسفیوں کو، جو مصر میں زندگی بسر کر رہے تھے، اپنے پاس بلایا اور انہیں مصری اور یونانی صنعتی اور علمی کتابوں کا

عربی زبان میں ترجمہ اور نقل نویسی کا کام سونپا تھا۔ اگر یہ بات درست ہے تو یقیناً غیر عربی سے عربی زبان میں ہونے والا یہ پہلا ترجمہ ہے جو انہوں نے کیا اور یہی ترجمے بعد کے برسوں میں اور عباسیوں نیز مامون کے زمانے میں ہونے والے تراجم کی بنیاد رہے ہوں گے۔ امویوں کے زمانے میں محاسبات اور سرکاری دیوانوں کے عربی میں ترجمے ہوئے جو اس وقت تک پہلوی اور رومی میں لکھے جاتے تھے جن کی تفصیلات تاریخ کی کتابوں میں دیکھی جاسکتی ہیں۔

مجموعی طور پر خاندان بنی امیہ کی حکومت میں ان اسباب وعلل کی وجہ سے جن کا ذکر کیا گیا اور اسلامی ممالک واقوام کے مابین ایک دوسرے سے میل جول نہ ہونے کی وجہ سے کوئی علمی کام صحیح طور پر انجام نہ پاسکا اور اگر طب یا معدودے چند کتابوں کا ترجمہ ہوا بھی ہے تو وہ صرف مجبوری کی بنا پر ہوا ہے۔ کیونکہ خلفاء کو طبیب اور اپنے حسابوں کی جانچ پڑتال کے لئے بعض فنون مثلاً کیمیا کی ضرورت تھی۔ ورنہ اس عہد میں کسی مدون یا عالمانہ تحقیقی کتاب یا مفید ترجمے کا کسی نے ذکر نہیں کیا ہے اور جیسا کہ عرض کیا گیا عہد اموی بھی اسلامی ثقافت کے اعتبار سے خلفائے راشدین کے عہد جیسا ہی ہے۔ صرف اتنا فرق ہے کہ امویوں کے احمقانہ تفاخر اور بچگانہ نسلی تعصبات شاید شعوبیہ فرقے کے وجود میں آنے کا سبب بنے۔

حق تو یہ ہے کہ اموی حکومت میں علما کی قدر ومنزلت تھی اور عالم کو شریف اور محترم سمجھا جاتا تھا اور نسلی تفاخر اور عربی تعصب ان کے مقام ومرتبے کو کم نہیں کرتا تھا۔ عالم خواہ عرب کا ہو یا عجم کا، قابل احترام تھا۔ بنو امیہ غیر عرب دانشوروں مثلاً حسن بصری، محمد بن سیرین اور عطا بن یسار کا اسی طرح احترام کرتے تھے جس طرح وہ عرب دانشوروں مسروق بن اجدع، شریح اور قتادہ کا احترام کرتے تھے، شروع کے تمام دانشور جو سب کے سب غیر عرب تھے، درس وتدریس کی مجلس برپا کرتے تھے جن میں عرب اور غیر عرب بلا کسی امتیاز کے شرکت کرتے تھے اور استادوں کے علم سے فیض یاب ہوتے تھے حتیٰ کہ حسن بصری اپنے درس کے جلسوں میں خلفائے بنی امیہ اور نامی گرامی سردار یزید بن مہلب پر سخت تنقیدیں کرتے

تھے اور کھل کر کہتے تھے کہ ”یزید اور بنی امیہ دیو صفت گمراہ ہیں جن سے پرہیز کرنا چاہئے۔“ اس کے باوجود جب حسن بصری کا انتقال ہوگیا تو ان کے جلوس جنازہ میں شہر کے تمام لوگوں نے شرکت کی۔ مجمع اتنا تھا کہ اس زمانے میں مسجد میں نماز پڑھنے کی جگہ نہیں تھی اور لاکھوں مرد عورتیں صرف انکے جلوس جنازہ میں شرکت کے لئے آئے تھے۔۱۵

اموی حکومت کے اواسط میں مفتوحہ ممالک کی اقوام کی اسلامی اصولوں کی تشریح وتوضیح نیز عربی زبان سے آشنا ہونے کی ضرورت کے پیش نظر جو سیاسی اور دینی زبان تھی، کچھ فقیہ یا دانشور اور نحوی وصرفی اور مفسر وغیرہ پیدا ہوئے۔۱۶ ان دانشوروں اور نحویوں نے بھی جو کچھ سیکھا تھا اس کی تعلیم دینے کے لئے ، حلقات درس“ کے نام سے مدارس کھول رکھے تھے۔جن کی تفصیل میں جانے سے گریز کرتے ہیں۔

عہد عباسی کے علوم:

ایران وروم ومصر ومراکش واندلس اور اسلامی سلطنت کی مختلف اقوام ، اقتصادی اتحاد کے وجود میں آنے کی وجہ سے ایک دوسرے سے اختلاط وآمیزش پر مجبور تھیں اور خواہ ان عظیم ممالک پر عرب قوم کے تسلط اور اسلام کے احکامات پر عمل درآمد سے یہ آمیزش واختلاط بہت ضروری ہوگیا اور اسی سبب سے ابھی اسلام کی پہلی صدی بھی ختم نہیں ہوئی تھی کہ ان اقوام نے ایک دوسرے کو سمجھنے کی غرض سے اپنے علمی آثار سے فائدہ اٹھانا شروع کردیا جس کے نتیجہ میں اقوام ایک دوسرے کو اچھی طرح سمجھ سکیں۔ اسکے لئے ایک زبان لازم تھی جس میں وہ اپنے علمی آثار اور کتب کا ترجمہ کریں۔ جو تمام اقوام کے درمیان مشترک ہو، اس مسئلے کو عربی زبان نے حل کردیا جو مسلمان فوجیوں کے ساتھ دنیا کے تمام علاقوں میں پہونچ چکی تھی اور عظیم اور متمدن اقوام جنہوں نے وسیع اسلامی سلطنت قائم کی تھی اس زبان سے اپنے علمی اور ادبی مفاہیم کو سمجھنے کا کام لیا تھا۔

اس زمانے میں ایران وروم کی دو بڑی اقوام نے اپنے زبردست تمدن کی بنا پر دیگر

اقوام سے زیادہ ادب وعلوم اسلامی سے بہت فائدہ اٹھایا کیونکہ یہ دونوں اقوام جنہوں نے قبل از اسلام بہت سی دیگر اقوام حتیٰ عربوں کا استحصال کیا تھا عظیم اور حیرت انگیز تمدن اپنے تمام وسائل کے ساتھ عربوں کے ہاتھ میں آگئیں اور اسلام کے زیر نگیں ہو گئیں لہٰذا اگر ہم یہ کہیں کہ اسلامی تمدن، ایران وروم کے تمدن کا ایک امتزاج ہے تو چنداں غلط نہ ہوگا۔

ایرانی قوم اسلامی تمدن کے تمام مظاہر وشعائر میں موثر واقع ہوئی اور اس مملکت میں اسلام کی آمد کے وقت سے ہی اس ملک کے علماء یا مصنفین اور ادبا نے عربی زبان سیکھی اور ابھی اس سرزمین میں عربوں اور اسلام کو آئے چند سال بھی نہ گذرے تھے کہ ''زیاد اعجم'' نے جو اصلاً اصفہانی تھا اور جس نے ایک عمر خراسان میں گذاری تھی اس زبان میں شعر کہنا شروع کردیا تھا اور ان ہی ابتدائی صدیوں میں بہت سے ایرانیوں مثلاً اسرۃ بن یسار نسائی اسماعیل بن یسار، محمد بن ابراہیم ۱۸ اور دیگر ایسے لوگوں کو پاتے ہیں جو عربی زبان میں شاعری کرتے تھے اور چونکہ اکثر شعوبی تھے اس لئے انہوں نے اپنے کلام میں ایرانیوں کو عربوں پر ترجیح دی۔ ان شعراء وادباء و مصنفین نے عربی شاعری، کتابت اور تصنیف وتالیف کا باب کھولا اور عہد جاہلیت کی شاعری کو جو صحرا وشتر ومعشوق کی تعریف سے آگے نہیں بڑھی تھی، اضمحلال، محویت اور نیستی سے نجات دی۔ خلافت اموی کے زبردست مصنفین اور منشیوں نے بھی تصنیف وتالیف اور کتابت کا باب کھولا جس سے عرب واقف نہیں تھے اور اسے اس حد تک بلند مقام پر پہنچا دیا جسے معجزہ ہی کہا جاسکتا ہے۔

بادیہ نشین عرب جنہیں اپنے تمدن کے پورے دور میں جز شتر، صحرا اور خار مغیلاں کے کسی اور موضوع سے سروکار نہیں تھا اور اپنی زندگی گذارنے کے لئے جنہیں صرف معدودے چند چیزوں کی ضرورت تھی، ممالک کی فتح اور ایران کے عظیم تمدن سے قربت کے بعد ایسے بہت سے حیاتی مظاہر سے آشنا ہوئے اور ان کے نام ایرانی زبان سے حاصل کئے جیسے کوزہ، طشت، خز، دیباج، یاقوت، فیروزہ، بلور، فالوزج، لوزینہ، فلفل، زنجبیل، نرجس، عنبر، کافور،

صندل، قرنفل، ارجون، بستان، جوز، دولاب، ابریق، زنبق، صولجان، کوسج، فرسخ، زنبید وغیرہ جن کے ذکر کے لئے علاحدہ کتاب کی ضرورت ہوگی۔ چنانچہ بہت سے ماہرین لغت نے اس قسم کے الفاظ کو، دخیل، کا نام دیا ہے اور لغت کی ضخیم کتب مثلاً المعرب تالیف جو الیقی میں شامل کیا ہے۔

ان دوموضوعات یعنی شاعری اور لغت نویسی اور عربوں پر اس کے اثرات کو نگاہ میں رکھتے ہوئے قیاس کیا جاسکتا ہے کہ ایران کا حیرت انگیز تمدن اسلامی ثقافت کی پیشرفت میں کس حد تک موثر رہا ہے۔ ابتدائی صدیوں کی ادبیات ورویات کی تمام کتابیں ایرانیوں کے علمی، ادبی، فلسفیانہ اور اخلاقی موضوعات سے بھری پڑی ہیں جن سے عربوں نے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھایا ہے۔عرب قوم حتی اپنی زبان کے وجود کو بھی ایرانیوں کا مرہون منت سمجھتی ہے کیونکہ یہ ایرانی قوم تھی جس نے عربی صرف ونحو کو ایک خاص طریقے سے سمجھا او درحقیقت اس کا احیا کیا۔ حدیث پیغمبرؐ کی جمع آوری، قرآن کریم کی تفسیر اور آیات قرآنی کی تعبیر گذاری جو براہ راست اسلام کی حیات سے تعلق رکھتی تھی، ایرانیوں کی مرہون منت ہے جو اس مملکت میں اسلام کے نفوذ کے ابتدائی برسوں سے ہی شروع ہوچکی تھی او رجس کا سلسلہ ہمارے عہد تک پھیلا ہوا ہے۔

بنی عباس کے عہد میں ایرانیوں کا اثر ونفوذ، ان وجوہ کی بناپر جنہیں تاریخ میں تلاش کیا جانا چاہئے، بہت بڑھ گیا اور اتنا بڑھا کہ درحقیقت حکومت اسلامی پوری طرح ایرانیوں کے ہاتھ میں آگئی اور برامکہ اور خاندان سہل کے ایرانی وزراء اور دیگر لوگوں کے ہاتھ میں درحقیقت حکومت اسلامی کی نبض تھی اور ساسانیوں کے رسوم وآداب دوبارہ زندہ ہوگئے۔ سرکاری دفاتر میں بھی عہد کہن کی رسومات کا سلسلہ شروع ہوگیا اور حکومت اسلامی کے اداروں اور دفتروں کی تشکیل بھی ساسانی عہد کی طرح کی گئی۔ عہد عباسی کی کتب تواریخ وسیر، حکومت بنی عباس میں ایرانی منشیوں اور وزرا کی کیفیت وطریقۂ کار سے بھری پڑی ہیں۔ اس

میں شک نہیں کہ ایک قوم کا دوسری قوم پر سیاسی اور اقتصادی اثر ورسوخ دوسرے تمام شعبوں پر بھی اثر انداز ہوا کرتا ہے۔ ایرانیوں نے چونکہ سیاسی اور اقتصادی لحاظ سے کافی اثر ورسوخ بڑھالیا تھا اس لئے ان کے علمی اور ادبی آثار بھی اس وقت کے تمام اسلامی ممالک میں پھیل اور اسلامی تہذیب وتمدن میں کچھ ایسا گھل مل گئے کہ آج بھی انہیں ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جاسکتا ہے۔ جن لوگوں نے زمانۂ قدیم سے ہی اسلام میں ایرانی تمدن کی تاثیر میں زبردست مدد کی وہ شعوبیہ تھے۔ واضح رہے کہ اس گروہ نے عربوں سے شدید مخالفت کی وجہ سے عہد ساسانی کے ایران کے بہت گرانقدر آثار کا عربی میں ترجمہ کیا، تاکہ غیر متمدن عربوں کے سامنے تمدن کی میزان پیش کرسکیں۔

شعوبیوں نے بہت سی ایرانی کتابوں کا پہلوی زبان سے عربی میں ترجمہ کیا۔ ان میں ادب، امثال وحکم، تاریخی کارنامے، قصص وحکایات اور کبھی نجوم ومنطق، حساب وہندسہ کی کتابیں ملتی ہیں جن میں بہت سی کتابوں کا ذکر ابن ندیم نے الفہرست میں کیا ہے جن کا یہاں ذکر طوالت کلام کا باعث ہوگا۔ لیکن اس نکتے پر توجہ رہنی چاہئے کہ ان کتابوں کے ترجموں نے اسلامی علوم کی پیشرفت میں بہت اہم کردار ادا کیا اور نئے نئے علوم کی بنیاد بنے نیز بعد میں بڑے بڑے علماء اور اساتذہ کے وجود میں آنے کا سبب ہوئے جن میں ابونصر فارابی، ابوعلی سینا اور ابوریحان بیرونی وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ ان لوگوں کی عالمی شہرت کا سلسلہ اسی زمانے سے شروع ہوا اور اسی زمانے سے عالمی شہرت حاصل کی۔

لیکن اسلامی تمدن پر روم ویونان کے اثرات بھی نہایت حیرت انگیز رہے کیونکہ اسکندریہ میں نوافلاطونیوں نے اپنے افکار وعقائد کی تعلیم دینا شروع کردی تھی کہ اسلام نے انہیں فتح کرلیا اور بعد میں جیسا کہ کتب ملل ونحل میں ملتا ہے وہ آراء وعقائد معتزلہ، صوفیوں اور خاص کر اخوان الصفا کے حکما کے ذریعے پورے اسلامی ممالک میں پھیل گئے اور سریانی،

بین النہرین اور نصیبین میں فلسفۂ یونان وروم کی تبلیغ میں مشغول تھے کہ اسلام وہاں جا پہنچا اور اس قوم کے علم ومعرفت کے عظیم خزانوں سے فائدہ اٹھایا۔

تین علمی مراکز:

یہاں صدر اسلام کے ان تین علمی مراکز کا مختصراً تذکرہ ناگزیر ہے جنہوں نے درحقیقت اسلام میں مغرب ومشرق کے علوم وفلسفہ کے نفوذ میں نمایاں کردار ادا کیا ہے اور جو علم وفلسفۂ اسلامی کے وجود میں آنے کا اصلی سبب بنے۔ یہ تین اہم مراکز تین شہروں جندی شاپور، حران اور اسکندریہ میں واقع تھے۔

۱۔ جندی شاپور:

یہ شہر مورخین ومحققین کے بقول خوزستان میں واقع تھا اور یہ وہی شہر ہے جسے عربوں نے الاھواز کہا ہے جو موجودہ زمانے میں شہر دزفول اور شوشتر کے درمیان واقع ہے اور اب بھی اس کے خرابات دریائے کارون کے قریب شاہ آباد کے نام سے موجود ہیں۔ اسے ساسانی بادشاہ شاپور اول (۲۴۱ تا ۲۷۲ عیسوی) نے رومی سلطنت پر قبضہ کرنے کے بعد قائم کیا اور رومی قیدیوں کو وہاں رکھا۔[۱۹] انوشیرواں نے وہاں ایک اسپتال تعمیر کروایا جہاں اطبا مریضوں کے علاج معالجے میں مشغول رہتے تھے۔ اس نے وہاں ایک طبیہ کالج بھی قائم کیا جو اس زمانے میں بہت مشہور تھا اور وہاں طالب علموں کو یونانی اور آرامی زبانوں میں اس فن یا علم کی تعلیم دی جاتی تھی۔ مسلمانوں نے خوزستان کو فتح کرتے ہی اس شہر کو بھی فتح کرلیا۔ بیمۂ عہد عباسی تک جندی شاپور اور اس کا کالج واسپتال بھرا پڑا تھا لیکن ساتویں صدی ہجری میں یعنی اس وقت جب مشہور مسلمان جغرافیا داں یاقوت حموی حیات تھا، یہ شہر ویران ہوچکا تھا اور یہاں جز خرابات کچھ اور باقی نہیں بچا تھا۔[۲۰] قفطی کے بقول اس شہر کو قسطنطنیہ کی طرح آباد کیا گیا تھا اور جن لوگوں نے اس شہر کے پہلے طبی کالج میں تعلیم دی وہ رومی علما تھے (جن کے بارے میں مستشرقین کا خیال ہے کہ وہ شاہ بیزانس ژوستین کے عہد میں

فرار کر کے ایران آ گئے تھے) لیکن جب ایک مدت گذر گئی تو علاقے بلکہ دیگر جگہوں کے ایرانیوں نے بھی مذکورہ طبی کالج میں تعلیم حاصل کی اور پھر رومی اساتذہ کی جگہ تدریس کا کام کیا۔ یہ علم روز افزوں بہت مقبول ومشہور ہونے لگا اور اساتذہ واطبانے مزید قواعد وقوانین بنائے اور علاج معالج کے نت نئے طریقے سے آشنا ہوئے۔ انوشیرواں کی حکومت کے آٹھویں سال اس طبی کالج کے حکیموں نے کسری کے حکم سے علم طب میں مناظرہ کیا اور اس کے اہم مسائل پر روشنی ڈالی۔ ۲۱ جندی شاپور کے اطباء کا خیال تھا کہ صرف وہ اس علم کے حق دار ہیں اور یہ علم ان کے درمیان سے باہر نہیں جائے گا۔اور دوسروں میں اتنی صلاحیت نہیں ہے کہ وہ اس سے فائدہ اٹھائیں ۲۲

جندی شاپور اس زمانے میں علم طب کی تعلیم کا مرکز تھا اور اس علم کو حاصل کرنے کے لئے علماء وفضلاء اور نوآموز اس کالج میں آتے تھے منجملہ عرب کے مشہور طبیب حارث بن کلدہ ثقفی نے ، جو حضرت رسولؐ کے زمانے میں تھا، اس کالج میں طب کی تعلیم حاصل کی تھی اور ایک عرصہ تک فارس میں علاج معالجہ کے کاموں میں مشغول رہا۔ ۲۳ اس کالج میں یونانی، ایرانی اور ہندوستانی طب کی تعلیم دی جاتی تھی اور بہت سے بڑے ہندوستانی اطباء پہلوی زبان میں اس علم کی تعلیم دیتے تھے۔

یہ کالج جیسا کہ عرض کیا گیا ، عہد اسلام میں ختم نہیں ہوا بلکہ اس عہد کے خلفاء اور اونچے طبقے کے لوگوں کو اطبا کی ضرورت کے پیش نظر بدستور باقی رہا جیسے ایرانیوں کے عہد میں تھا۔صرف اتنا ہی نہیں بلکہ عباسیوں کے زمانے میں اس میں ترقی ہوئی اور غالبًا خلفا جب بیمار ہوتے تو اسی کالج کے اطباء سے رجوع کرتے تھے منجملہ خلیفۂ دوم عباسی ابوجعفر منصور بغداد کو آباد کرنے کے زمانے میں پیٹ کے شدید درد میں مبتلا ہوا اور اس کے اطباء دوبار اس کے معالجے میں ناکام رہے تو اسے جندی شاپور کے کالج اور دار الطب کے سرپرست وسربراہ جرجیس بن بختیشوع کے پاس لے گئے اور اس نے منصور کا علاج کیا ۲۴ مشہور عباسی خلیفہ

ہارون الرشید نے جبرئیل بن بختیشوع کو جندی شاپور کے طبی کالج کا پرنسپل بنایا اور اسے حکم دیا کہ وہ بغداد میں جندی شاپور جیسا کالج بنائے۔۲۵

ساسانیوں کے عہد میں یہ کالج اور اسپتال بہت مشہور تھا اور بڑے بڑے اطبا نے وہاں تربیت حاصل کی تھی جن میں سے زیادہ تر مسلمان اور غیر مسلم اقوام سے متعلق تھے۔

عہد اسلام میں جس پہلے شخص نے اسپتال بنوایا اس کا نام ولید بن عبد الملک تھا اس نے جو اسپتال بنوایا تھا اس میں اطبا کو جمع کیا اور ان کے لئے آراضی وغیرہ مقرر کیا اور حکم دیا تھا جذام کے مریضوں کو اسپتال کے ایک حصے میں علاحدہ رکھا جائے تاکہ عام مریضوں سے ان کی آمیزش نہ ہوسکے۔ دوسرے حصے میں نابیناوں کو رکھا جائے۔ ان کے لئے بھی جذام کے مریضوں کی طرح اراضی وغیرہ مقرر کی گئی تھی۔۲۶

۲۔حرّان:

صدر اسلام کا دوسرا علمی مرکز شہر حران تھا۔ یہ وہ شہر ہے جو جعفر فیا دانوں کے خیال میں جزیرہ کے قریب واقع تھا اور آج ادسا اور راس العین کے درمیان واقع ہے۔ یہ بہت پرانا شہر ہے اور یونان وروم، عیسائیت واسلام کی تاریخ کا ایک دور اس نے دیکھا ہے۔ یہ اسکندر مقدونی کے عہد میں آباد تھا اور کئی خداؤں کے مرکز کے نام سے مشہور تھا۔

عیسائیوں کے عہد میں شہر حران مختلف اقوام وملل کا مرکز تھا اور اس کے اصلی باشندے سریانی تھے لیکن بہت سے مقدونی، یونانی، رومی، ارمنی اور عرب بھی وہاں ساکن تھے اور جب عیسائیت نے غلبہ پایا تو اس عہد کی پوری مغربی دنیا اور رومی سلطنت وقلمرو میں نفوذ حاصل کرلیا۔ رومیوں نے حران کے لوگوں کو بھی عیسائی بنانا چاہا لیکن انہیں کامیابی نہیں ملی اسی لئے کلیسا والے حران کو بت پرستوں کا شہر یا (Helenopolis)۲۷ کہتے تھے اور آہستہ آہستہ یہ شہر حقیقت میں بت پرستوں کا ملجا وماوی بن گیا۔ جو شخص بھی عیسائی بننا نہیں چاہتا۔ چاہے وہ جس قوم وقبیلہ کا ہو، اس شہر کی جانب رخ کرتا تھا۔ لہذا کافی تعداد میں رومی، یونانی، ارمنی اور عرب

وغیرہ اس شہر میں جمع ہوگئے اور بظاہر ان کا مذہب بابلی، یونانی اور نوفلاطونی وغیرہ ادیان کا امتزاج تھا۔ یہ مذہب اسلام کی نشر واشاعت اور عہد مامون تک اس شہر میں عام تھا۔ اس عہد میں انہیں صائبین کہا گیا۔ قرآن کریم میں اس مذہب کا کئی جگہ نام آیا ہے۔۲۸؎

صائبین وہ لوگ تھے جو ظہور اسلام کے وقت ایک خالص مذہب کے ماننے والے تھے۔ انہیں کبھی مغتسلہ کہا گیا تو کبھی پیروان یحیٰی۔ یہ خدا فرشتوں اور قیامت پر عقیدہ رکھتے تھے۔ ان کے مخصوص رسوم وآداب تھے جن کا ذکر ملل ونحل کی کتابوں میں ملتا ہے۔۲۹؎

ابن ندیم نے حران والوں کے صائبین کہلانے کی وجہ تفصیل سے بیان کی ہے۔۳۰؎

بہر حال حران والوں نے فلسفۂ یونان وروم سے آشنائی اور مغربی علوم وادبیات پر مکمل عبور رکھنے کی وجہ سے اسلام کے علمی ارتقا میں زبردست کردار ادا کیا اور روم کے مفتوحہ علاقوں میں اس دین کی نشر واشاعت کے آغاز سے ہی مسلمانوں کے ساتھ گھل مل گئے اور چونکہ وہ ذمی تھے اس لئے جذیہ ادا کرکے عربوں کی گزند سے محفوظ نیز مسلمانوں کے ساتھ بیشتر گھل مل جانے میں بھی کامیاب رہے۔ انہوں نے اپنے شہر میں ایک مدرسہ قائم کیا تھا جہاں مختلف قدیم علوم اور فلسفۂ روم ویونان کی مختلف اقسام کی تعلیم دی جاتی تھی اور جس مدرسہ نے بھی معاشرے کو بڑے بڑے علما دیے۔ ان مدارس میں نجوم وریاضیات کی تعلیم دی جاتی تھی اور فلسفۂ افلاطون پر بھی غور وفکر کی جاتی تھی۔

اس مرکز کے جن علمانے اپنا علم خلفائے اسلام کے اختیار میں دیدیا تھا ان میں ایک ثابت بن قرہ حرانی (۲۲۱-۲۸۸ھ) تھا جو ریاضیات اور نجوم کا استاد تھا۔ دوسرا حکیم ابن سنان اور اس کا بیٹا ابراہیم بن سنان تھا جو علم طب وظواہر میں ماہر تھے۔ ان کے علاوہ ہلال بن ابراہیم طبیب اور اس کا بیٹا ابو اسحاق صابی ریاضی، ہندسہ وعلم ہیئت میں اور بتانی، رصد کواکب اور علم ہندسہ میں بہت مہارت رکھتے تھے۔۳۱؎

یونانی علوم جندی شاپور اور حران کے مدارس کے ذریعے مسلمانوں تک پہنچے۔ طب

یونانی نے جندی شاپور کالج اور اسکے علماء کے وسیلے سے اسلامی مملکت میں نفوذ پیدا کیا اور اس نے بڑے بڑے علماء دنیائے انسانیت کو دیئے۔ علوم ریاضی ہندسہ، نجوم، فلسفہ اور فلکیات بھی حران کے مدارس کے ذریعے دنیائے اسلام میں پہنچے اور علمائے اسلام نے ان علوم کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد ان میں زبردست مہارت بہم پہنچائی اور ان علوم کی مختلف اقسام یا شعبوں میں ایسے ایسے علماء اور فلسفی پیدا ہوئے جو یقیناً عصر اسلامی کے مفاخر میں شمار کئے جاتے ہیں۔

۳۔ اسکندریہ:

صدر اسلام میں تیسرا علمی مرکز شہر اسکندریہ تھا جو علوم اسلامی کی بنیاد ڈالنے میں دونوں مراکز کی طرح بہت فعال ومؤثر تھا۔ یہ شہر جیسا کہ تاریخ فلسفہ کے مطالعے سے معلوم ہوگا۔ دوسری صدی عیسوی سے نو افلاطونیوں کا مرکز بن گیا تھا۔

فلوطین (Plotin) ان کے مذہب وفلسفہ کا بانی تھا متعدد صدیوں کے دوران اس کے شاگردوں کی بدولت ان کے مذہب وفلسفہ نے ترقی کی۔ نو افلاطونیوں کا مذہب، حکمت اشراق وعرفان سے مشابہ چیز ہے جو فلسفیانہ اور علمی دلائل وبراہین سے آمیختہ ہے ۳۲ اور چونکہ اس مذہب کے ماننے والے اکثر عیسائی تھے لہٰذا اس مکتب کے فلسفہ کے ساتھ عیسائیت کے عقائد ونظریات بھی شامل ہوگئے اور ان کے عقائد وآرا نسطوریوں کی تعلیمات اور مدارس کے ذریعے جو عیسائیت کی ایک شاخ تھی، پورے مشرق قریب وسطی میں پھیل گئے۔ ۶۴۲ء میں جس سال عربوں نے اسکندریہ کو فتح کیا تھا نو افلاطونیوں کے افکار پوری طرح اس شہر کے مدارس اور مشرق قریب کے ممالک پر مسلط تھے۔ نسطوری چونکہ یونانی اور سریانی زبانوں پر عبور رکھتے تھے لہذا نو افلاطونیوں کی کتابوں کی نقل وترجموں میں بہت موثر واقع ہوئے۔ مثال کے طور پر ظہور اسلام کے وقت رومیوں کی پوری مشرقی قلمرو میں ان کے افکار ونظریات کا رواج تھا اور یہ نسطوری عیسائی تھے جو یونانی، سریانی اور عربی زبانوں سے واقفیت کی بنا پر اسلام کی علمی تحریک کے اولین مترجمین بن گئے۔

مدرسہ اسکندریہ، عربوں کے مصر پہنچنے کے وقت طب، کیمیا اور علوم طبیعیات کے لئے مشہور تھا نیز طلسمات کے سیکھنے اور سحر وجادو سے نجات پانے کے علاوہ نجوم میں بھی کافی شہرت رکھتا تھا۔ مسلمانوں نے عہد اموی سے اس مدرسہ کے علوم سے فائدہ اٹھانا شروع کیا اور بہت سی متداول علمی کتب کا اس مدرسہ میں عربی میں ترجمہ ہوا۔ اس مدرسہ کے بہت سے اطباء نے اس عہد کے خلفاء کا علاج معالجہ کیا لیکن عباسیوں نے مرکز خلافت سے اسکندریہ کی دوری اور اس شہر کے مدارس کے علماء کا ان کے عہد میں طلسمات وعزائم ونجات اور اس قسم کے دوسرے خرافات میں پڑنا، عرب فوجیوں کی آمد کے وقت شہر کے عظیم کتب خانوں کا تباہ وبرباد ہونا سپاہیان اسلام کی آمد سے قبل شہر کے علماء ومشاہیر کا فرار ہونا اور اسکندریہ کے نسطوری علماء کے صوفیانہ طرز عمل کے پیش نظر اس شہر کے مدارس سے زیادہ فائدہ نہیں اٹھایا۔ لیکن یونانی، سریانی اور رومی کتب کے عربی ترجمے اور اسکندریہ کے نسطوری علماء کے ذریعہ ارسطو، افلاطون اور جالینوس کی کتابوں کو عربی میں منتقل کرنے کے اعتبار سے عباسیوں کے عہد میں بہت کام ہوا۔

ان تین شہروں پر اسلام کا قبضہ ہونے سے ان کے مدارس میں زمانۂ قدیم سے جو علوم وفنون پڑھائے جاتے تھے وہ بھی اسلام کی دسترس میں آگئے اور ان مراکز میں متداول علوم سے فائدہ اٹھایا۔

مدرسہ جندی شاپور کے ایرانیوں اور ہندیوں نے، حران کے مدرسہ کے رومیوں اور سریانیوں نے نیز اسکندریہ کے نسطوریوں اور یعقوبیوں نے مروجہ علوم کی تعلیم اور انہیں عربی زبان میں منتقل کرکے ماضی کے علماء کے آثار کے تحفظ اور ان علوم کی حفاظت میں، جو انسان کے کئی ہزار سالہ فکر ودانش کے بعد میسر ہوئے تھے، عظیم خدمات انجام دیں اور درواقع یہی علما اسلامی مملکت میں عظیم ترین طبیب، فلسفی، عالم، مفکر، ریاضی داں، منجم اور مہندس کے وجود میں آنے کا باعث بنے جن میں ایک شیخ الرئیس ابوعلی سینا بھی ہیں۔

عربی میں فلسفہ وعلوم کی کتابوں کے تراجم:

علوم وفلسفہ کی کتابوں کے عربی تراجم کا آغاز درحقیقت عباسیوں کے عہد سے ہوا۔ عہد اموی میں جو تراجم ہوئے تھے وہ بہت کم تھے اتنے کہ اسلامی محققین نے ان کے ذکر کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ عہد اموی میں ان تراجم کو مقبولیت حاصل نہیں ہوسکی۔ عباسیوں کے اس کام میں بہت زیادہ دلچسپی لینے اور سرپرستی کرنے کی چند وجوہ ہیں۔

۱۔ در واقع عہد اموی تاریخ عرب و اسلام کے لحاظ سے دور جاہلیت کا باقی ماندہ دور تھا اور عربوں نے چونکہ بہت سے ملکوں پر قبضہ کر رکھا تھا لیکن اپنے جاہلانہ اصولوں پر ہی قائم تھے اور عہد جاہلیت کی بے خبری کے گرداب میں ہاتھ پیر مار رہے تھے اور کبھی بھی انہیں اس بات کی فکر نہیں ہوئی کہ عربستان سے باہر فلسفہ وعلوم ودانش کی حیرت انگیز طور پر فراوانی پائی جاتی ہے جن کا حصول، حیات سرمدی مل جانے کے مترادف تھا۔

۲۔ اموی خلفا جو خود جاہل عربوں میں سے تھے، اپنی نسلی برتری پر اعتقاد رکھتے تھے اور لہو ولعب میں مشغول رہتے تھے۔ انہوں نے کبھی بھی دوسری اقوام وملل پر کوئی توجہ نہیں دی تھی اور وہ یہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ دوسری اقوام ان سے بہتر تمدن اور دانش کی حامل ہیں۔ لہٰذا انہوں نے دیگر اقوام کے آثار پر توجہ نہیں دی اور غالباً خود کو چند عربی قصیدوں میں ہی سرگرم رکھتے تھے جو فلاں بدوی عرب شاعر نے کہے تھے۔

۳۔ عہد اموی کے اوائل کا زمانہ تقریباً خلفائے راشدین کے زمانے کی طرح ممالک کی فتح اور لشکر کشی میں گزرا اور اسلام نے ابھی تک وسیع وعریض سلطنت میں اپنا نفوذ پیدا نہیں کیا تھا اور وہ دینی تحریک جس کا لازمہ اطلاع اور مختلف علوم وفنون سے آگاہی ہے، وجود میں نہیں آئی تھی۔ اسلام کے تسلط اور مفتوحہ ممالک میں مسلمانوں کی ترقی نیز وسیع اسلامی سلطنتوں کے باشندوں کا اس نئے دین کو قبول کرنے کے ساتھ دینی تحریک شروع ہوئی اور مسلمان۔ قضا وقدر، حدوث وقدم عالم اور جبر و اختیار اور ان جیسے دیگر مسائل سے دو چار

ہوئے جن کا جواب علوم وفلسفہ سے واقفیت کے بغیر ممکن نہیں تھا۔

۴۔ مسلم ہے کہ دوسری صدی ہجری کے مسلمان، پہلی صدی خاص کر صدر اسلام اور اوائل عہد اموی سے بیشتر معتقد تھے اور ان مسلمانوں نے عیسائی، یہودی، زرتشتی، صابی وغیرہ مذاہب کے ماننے والوں سے اختلاط وآمیزش پیدا کی۔ مذکورہ مذاہب کے لوگ مسلمانوں سے مناظرے میں اس وقت کے متداول علوم اور متمدن ممالک کے فلسفہ سے باخبر تھے اور انہوں نے اپنے مذہبی مناظروں میں منطق ارسطو، فلسفہ افلاطون، مکتب نوافلاطونیان اور ایرانی علما کے اخلاقیات سے فائدہ اٹھایا، مسلمان بھی جو ان تمام باتوں سے بے خبر تھے اپنے مقدس دین کی حقانیت ثابت کرنے کے لئے ان علوم سے فائدہ اٹھانے پر مجبور ہوئے۔

۵۔ عباسیوں کے عہد میں اسلام کرۂ ارض کے ایک حصے پر، جو چین سے اندلس تک پھیلا ہوا تھا، مسلط تھا اور اس عظیم خطے کے تمام لوگ سیاسی اور اقتصادی وجوہ کی بنا پر عربی زبان سے واقف ہو چکے تھے اور اسی وحدت زبان اور ایک دوسرے سے اتحاد واختلاط نے ایک دوسرے کے حالات سے باخبر کیا اور یہ صورتحال اموی عہد میں موجود نہیں تھی۔

۶۔ خلفائے عباسی کا طب وفلسفہ ومنطق وریاضی ونجوم وغیرہ سے زبردست دلچسپی لینا بھی عربی میں مختلف کتابوں کے تراجم کا باعث بنا کیونکہ عباسی خاص کر منصور، رشید اور مامون نے علوم کے مذکورہ شعبوں پر خاص توجہ دی تھی اور غالباً علمائے فن سے یہ علوم سیکھتے تھے اور ان علوم کی تعلیم حاصل کرنے کے لئے چونکہ وہ کسی اور زبان سے واقف نہیں تھے اس لئے ان کتابوں کے تراجم سے استفادہ کرنے پر مجبور تھے۔

۷۔ عباسیوں کے عہد کی عظیم اسلامی سلطنت کی اقتصادیات ایک ہو چکی تھی جو نتیجے کی صورت میں ایک سیاسی پالیسی اختیار کرنے کی متقاضی تھی اور جہاں تک یہ واحد اقتصادیات مسلمانوں کی زندگی کے تمام شعبوں میں دیکھی جا سکتی تھی، اس میں مجبوراً علم وثقافت کو بھی

شامل کرلیا گیا۔ بنابرایں عباسیوں کے عہد میں چونکہ مصری، مراکشی، ایرانی، رومی اور سریانی وغیرہ ایک اقتصاد کے تحت زندگی بسر کررہے تھے اس لئے ثقافت کے اعتبار سے بھی متحد ہونے پر مجبور تھے اور ثقافتی اتحاد کا واحد راستہ کسی ایک زبان میں ان اقوام کے متمدن آثار کا ترجمہ تھا چنانچہ عربوں کے تسلط کی وجہ سے عربی کا انتخاب کیا گیا۔

۸۔ امویوں کو اسلام کی زبردست طاقت اور صدر اسلام کے مسلمانوں کے جنگجویانہ اور بہادرانہ جذبات نیز اسلام و مسلمین کی زبردست طاقت کے پیش نظر زیر دست اقوام کی ضرورت نہیں تھی کیونکہ بنی امیہ اسلام کی آئیڈیالوجی کے حامل ومحافظ تھے جو اس زمانے میں ان وجوہات کی بنا پر جن کا مشاہدہ اس وقت کی اقتصادی اور سیاسی تاریخ میں کیا جاسکتا ہے، بہت طاقتور ہوچکے تھے اسی وجہ سے عرب کے مسلمان دیگر اقوام کی ضرورت محسوس نہیں کرتے تھے لیکن بعد کی صدیوں میں جب مسلمانوں کی زبردست طاقت میں رخنہ پیدا ہوا اور اب عرب سپاہ صرف جہاد فی سبیل اللہ کے اصول پر اطراف کے ممالک پر حملہ آور نہیں ہوسکتے تھے نیز اندرونی مخالفین بھی ان نئے مہمانوں کی سرکوبی کے لئے لیس ہوچکے تھے، خلفا اور اسلامی حکمراں مجبور ہوگئے کہ اندرونی دشمنوں کی قوت کو خود کو محفوظ کرنے کے لئے استعمال کریں۔ مملکت کے اندر اسلام کے مخالفین جیسا کہ عرض کیا گیا، اپنے عہد کے رائج علوم مثلاً فلسفہ ومنطق کے حامل تھے اور علوم کی طاقت سے مسلمانوں کا مقابلہ کرتے تھے لہذا مسلمانوں کے لئے ناگزیر تھا کہ وہ اپنی کمزوریوں کا دفاع کرنے کیلئے خود دشمنوں کی طاقت کو ان کے خلاف استعمال کریں۔ اس لئے وہ اس زمانے کے علوم وفلسفہ کی تعلیم حاصل کرنے لگے تاکہ اسی حربے سے دشمنان اسلام و مسلمین کو ممالک اسلامیہ کے اندر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے دفن کردیں۔

اسلام پر حملہ براہ راست حکمراں جماعتوں پر حملہ تھا اور مسلمانوں کی شکست کا مطلب حکمراں جماعت کی کمزوری کا آغاز تھا۔ اس لئے عباسیوں نے جن کی تفصیلات تاریخ کی کتابوں میں دیکھی جاسکتی ہیں، مخالفین کو کچلنے کے لئے شمشیر کا سہارا لینے کے ساتھ مخالفت

کی بنیاد کا قلع قمع کرنے کے لئے ان اسلحوں سے خود کو لیس کرنا ضروری سمجھا جن سے ان کے دشمن لیس تھے۔ شعوبیوں زندیقوں، یہودیوں، عیسائیوں اور صابئیوں نیز اسلامی فرقے اسماعیلی، قرامطہ، شیعہ اور خلافت کے دیگر مخالفین علم ومعرفت سے لیس تھے، وہ بھی اجباری طور پر ان اسلحوں سے لیس ہوئے تا کہ اپنے اندرونی دشمنوں سے مقابلہ کرسکیں۔ اور خود کو نابودی سے بچائیں۔

لہٰذا مذکورہ بالا اسباب وعلل کی وجہ سے عربوں کے مفتوحہ ممالک کے علوم و اور ان کی ثقافت اسلام میں داخل ہوگئی اور اس ثقافت کے نفوذ کی بقا کا واحد ذریعہ عربی زبان میں مختلف اقوام و ملل کے علمی، ادبی فلسفیانہ اور منطقی متون کا ترجمہ تھا۔ ان متون کا جس قوم نے پہلی بار ترجمہ کرنا شروع کیا وہ ایرانی تھے۔ اس کی تفصیل اسلام کی سیاسی تاریخ میں دیکھی جاسکتی ہے۔ وہ پہلی قوم جس نے عربوں کی نسلی برتری کی منطق کو قبول کرنے سے انکار کردیا، وہ ایرانی تھی۔ ایرانی وہ اولین لوگ تھے جنہوں نے اس بچکانہ منطق کی مخالفت کی اور جو راستہ اختیار کیا اس کا مقصد عربوں اور دیگر مسلم اقوام کے سامنے اپنی تہذیب وتمدن کا مظاہرہ کرنا تھا اور اپنی عظیم تہذیب وثقافت کی نشان دہی کا واحد طریقہ فارسی متون کا عربی زبان میں ترجمہ تھا۔ لہٰذا کچھ ایرانیوں نے جو عربی اور فارسی زبانوں سے واقفیت رکھتے تھے فارسی کتابوں کے عربی ترجمے کی راہ میں بے پایاں کوششیں کیں۔

صاحب الفہرست ابن ندیم نے اپنی کتاب کا ایک باب ایرانی مترجمین سے مخصوص کیا ہے اور بے شمار ایرانی مترجمین کے نام گنوائے ہیں جن میں صف اول کے پندرہ ایرانی مترجمین کے نام یہ ہیں۔

۱۔ ابن مقفع ۲۔ خاندان نوبخت ۳۔ موسیٰ ویوسف۔ ابن خالد، جو داود بن عبد اللہ بن حمید بن قحطبہ کے ملازمین میں تھے اور جو فارسی کی کتابوں کے عربی میں ترجمے کرتے تھے۔ ۴۔ ابالحسن علی بن زید تمیمی، جس نے زیج شہریار کا ترجمہ کیا۔ ۵۔ حسن بن سہل ۶۔ بلاذری

۷۔ جبلتہ بن سالم دبیر ہشام ۸۔ اسحٰق بن یزید جو اختیار نامہ کا مترجم ہے۔ ۹۔ محمد بن جہم برمکی۔ ۱۰۔ ہشام بن قاسم ۱۱۔ موسیٰ بن عیسیٰ الکردی ۱۲۔ زادویہ شاہویہ اصفہانی۔ ۱۳۔ محمد بن ابراہیم بن مطیار اصفہانی۔ ۱۴۔ بہرام ابن مردان شاہ موبد شہر یار ۱۵۔ عمر بن فرخان۔

مذکورہ مترجمین نے بیشتر علمی، ادبی، تاریخی اور فلسفیانہ متون اور دیگر علوم کو فارسی سے عربی میں منتقل کیا مثلاً ابن مقفع نے 'خدائی نامک' کو پہلوی سے عربی میں منتقل کیا اور اسے ''تاریخ پادشاہان ایران'' کا نام دیا اور بظاہر محمد جریر طبری نے عہد ساسانیان کے وقائع کے ذکر میں اس کتاب سے بہت کام لیا ہے۔ ابن مقفع نے اس کے علاوہ کتاب آئین نامہ کا ترجمہ کیا جو قدیم ایرانیوں کے آداب و رسوم اور طور طریقوں کے ذکر میں ہے۔ مسعودی نے اس کتاب کا ذکر اہمیت کے ساتھ کیا ہے وہ کہتا ہے یہ ایک بہت بڑی اور ضخیم کتاب ہے جو ہزاروں صفحات پر پھیلی ہوئی ہے۔ ابن مقفع نے کلیلہ ودمنہ، شرح احوال مزدک، کتاب درحالات انو شیرواں اور کتاب ادب الکبیر وادب الصغیر کے بھی عربی میں ترجمے کیے ۳۴ے

ایرانی مترجمین نے ادبی اور تاریخی متون کے تراجم کے علاوہ بہت سے علمی، فلسفی اور دینی متون کے بھی عربی میں ترجمے کیے منجملہ ابن مقفع نے ارسطو کی کتاب منطق کی تین فصلیں۔ قاطیغوریاس ۳۵ے باری ارمیاس ۳۶ے اور انا طولیقا ۳۷ے کا سلیس اور آسان ترجمہ کیا۔

ابن الندیم، حمزہ بن حسن اصفہانی، مسعودی اور دیگر ایرانی محققین نے اپنی کتابوں میں ایسے بہت سے ایرانیوں کا ذکر کیا ہے جنہوں نے علمی اور فلسفیانہ متون کا فارسی سے عربی میں ترجمہ کیا۔ ان تمام مترجمین کا ذکر یہاں طوالت کا باعث ہوگا۔ ۳۸ے

علمی متون کے عربی تراجم کا سلسلہ تقریباً منصور عباسی کی خلافت کے زمانے سے شروع ہوا اور اسی زمانے سے ہی مترجمین نے ہندی، سریانی یونانی، مصری اور رومی زبانوں کے متون عربی میں منتقل کرنا شروع کیے اور انہوں نے فلسفہ و منطق ارسطو، آراء افلاطون وذو افلاطون، فلسفۂ ہندیان، فلکیات یونانیان اور طب رومیان وایرانیان کو عربی میں منتقل کر

ڈالا۔ مامون کے عہد تک متون کے تراجم کا عمل ذرا سستی اور کندروی سے انجام پاتا رہا اور صرف منطق و مجسطی اور چند طبی کتب نیز فلسفہ ارسطو وافلاطون کے چند مباحث کے سوا غالباً کسی اور چیز کا عربی میں ترجمہ نہیں ہوسکا تھا لیکن مامون کے عہد میں ہی ایران، حران، ہندوستان، اسکندریہ وغیرہ کے علمانے علمی، فلسفی، ادبی اور تاریخی متون کے ترجمے کیے۔

مامون (عباسی خلیفہ) ایک عالم اور دانشور شخص تھا اور علما ودانشوروں کی بہت زیادہ قدردانی کیا کرتا تھا۔ جعفر بن محمد انماطی جو اپنے وقت کا ایک عالم اور دربار خلافت سے متعلق تھا، کہتا ہے کہ "جب مامون بغداد آیا اور تخت خلافت پر بیٹھا تو اس نے دار الخلافہ میں ایک ایسا ہال بنولیا جہاں فقہا اور متکلمین جمع ہوتے تھے اور وہ خود بھی موجود رہتا تھا اور ان کے بحث ومباحثہ اور مناظرہ کو غور سے سنا کرتا تھا۔ اس نے اس زمانے کے سو فقہا کو بلایا اور ان میں دس کا اپنی مصاحبت ومجالست کے لئے انتخاب کیا جن میں ایک احمد بن ابی داود اور دوسرے بشر المریسی اور تیسرے میں خود یعنی جعفر بن محمد انماطی تھے۔ ایک دن ہمیں کھانا کھلایا گیا۔ دسترخوان پر تقریباً تین سو اقسام کے کھانے تھے اور مامون نے طبی نقطہ نظر سے ہر ایک کے خواص بیان کئے اور کہا فلاں غذا رطوبت کے لئے، دوسری صفرا دور کرنے کے لئے تیسری سودا کو روکنے اور چوتھی اور پانچویں غذا فلاں فلاں مرض میں مفید ہے۔ ۳۹؎

عہد مامون کے مورخین نے مامون کی علم دوستی اور اپنے زمانے کے علوم سے متعلق معلومات کے سلسلے میں حکایات درج کی ہیں جن کا ذکر ایک علاحدہ کتاب کا متقاضی ہے۔ یہاں اتنا ہی اشارہ کافی ہوگا کہ وہ ادب، تفسیر، حدیث، طب فلسفہ اور اپنے زمانے کے دیگر علوم سے واقف تھا اور ہر ایک سے آگاہ تھا اور بعض مورخین نے اقلیدس ہفتم کے حل کو اس سے منسوب کیا ہے۔

مامون عباسی نے اپنے بیٹے کو ہارون الرشید کے دربار میں بھیجا جو خلافت کے جاہ و حشم کے اعتبار سے پوری اسلامی تاریخ میں بے نظیر تھا۔ یہ دربار عیش وعشرت کے انواع و

اقسام کے وسائل سے مملو ہونے کیساتھ ساسانیوں کے عہد سے بھی بڑھ گیا تھا، چونکہ علماء ودانشوروں کی روزی روٹی کا واحد وسیلہ تھا لہذا ہر عالم اور دانشور خود کو اس سے قریب کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ مامون رشید دربار کے زبردست عالموں سے علوم وفنون کی تعلیم میں مشغول ہوگیا اور ان سے علوم حاصل کئے نیز اپنی عمر کا ایک حصہ ایران میں گذارا اور فضل بن سہل ملقب بہ ذوالریاستین جیسے ماہر اور ذی علم وزیر سے جو ایرانی اور ایک زبردست عالم تھا، کسب فیض کیا۔ اسی فضل اور اس کے خاندان نے مامون الرشید کو کتب کے ترجموں کی جانب متوجہ کیا نتیجتاً تخت خلافت پر بیٹھتے ہی اور بغداد پہونچتے ہی اس نے عالم اسلام اور دیگر غیر اسلامی ممالک کے علماء دانشوروں، فلسفیوں، فضلاء، شعرا اور مصنفین کو اپنے یہاں بلایا اور "بیت الحکمت" میں علمی، ادبی فلسفی اور طبی متون کے تراجم کرائے۔

بغداد کا بیت الحکمت یا مامون کا مخصوص کتب خانہ، عالم اسلام کے عظیم ترین کتب خانوں میں ایک تھا۔ افسوس کہ اس کتابخانے کے سلسلے میں جسے کتابوں میں خزینۃ الکتب اور بیت الحکمت کے ناموں سے یاد کیا گیا ہے، ہماری معلومات بہت کم ہیں۔ اس مرکز علم ودانش کے بارے میں مفصل معلومات دستیاب نہیں ہوئیں۔

حواشی:

۱۔تفسیر طبری جلد چہارم ص ۲۵

۲۔اغانی جلد ۱۴ ص ۱۵۰

۳۔شرح نہج البلاغہ طبع مصر جلد اول ص ۱۸

۴۔ زہر الادب حاشیہ عقد الفرید جلد اول ص ۲۲

۵۔کتاب المعارف ابن قتیبہ ص ۲۹

۶۔اغانی جلد ۹ ص ۸۸

۷۔کتاب المعارف ص ۲۹

۸۔ زہر الادب حاشیہ عقد الفرید جلد اول ص ۲۲
۹۔ عقد الفرید جلد ۳ ص ۲۹۶
۱۰۔ مذکورہ کتب خانے کے بارے میں تفصیلات کے لئے ملاحظہ کریں: کتب خانۂ اسکندریہ از مولانا شبلی نعمانی
۱۱۔ سبک شناسی جلد اول ص ۱۵۹
۱۲۔ اغانی جلد ۱۶ ص ۸۸
۱۳۔ عصر المامون جلد اول ص ۸۴
۱۴۔ ابن خلکان جلد دوم ص ۴۰۸
۱۵۔ ان دانشوروں سے آگاہی کے لئے ملاحظہ کریں: ابن خلکان، اعلام الموقعین وطبقات ابن سعد
۱۶۔ زیاد اعجم کے حالات میں مزید تفصیل کے لئے ملاحظہ کریں: اغانی جلد ۱۴ ص ۹۹
۱۷۔ ملاحظہ کریں: عیون الاخبار والشعرا والشعری ابن قتیبہ: اغانی ومعجم الادبا اور اخبار وسیر کی دیگر کتب
۱۸۔ دائرۃ المعارف اسلامی ذیل کلمہ، جندی شاپور،
۱۹۔ معجم البلدان یاقوت ذیل کلمہ' جندی شاپور،
۲۰۔ اخبار الحکما ص ۱۳۳
۲۱۔ المصدر نفسہ ص ۴ ۱۷
۲۲۔ اخبار الحکما ص ۱۶۱
۲۳۔ اخبار الحکما ص ۱۵۸
۲۴۔ اخبار الحکما ص ۳ ۸۳
۲۵۔ خط مقریزی جلد چہارم ص ۲۵۸
۲۶۔ دائرۃ المعارف اسلامی ذیل کلمہ' حران'

۲۷۔ ملاحظہ کریں: قرآن کریم سورہ بقرہ آیۂ ۵۹: سورہ مائدہ آیہ ۴۳ و سورۂ حج آیہ ۱۷

۲۸۔ ملل ونحل شہرستانی حاشیہ الفصل جلد دوم ص ۷۶ تا ۷۹ : مسعودی جلد اول ص ۳۷۸ وقفطی ص ۳۱۱

۲۹۔ الفہرست: ابن الندیم ص ۳۲۰

۳۰۔ مزید تفصیل کے لئے ملاحظہ کریں: تاریخ الحکماء از قفطی وشہرزوری وقاضی صاعد اندلسی وطبقات الاطبا ابن اصیبعہ اور علما واطبا وفلاسفہ اسلام کے دیگر تذکرے۔

۳۱۔ تفصیل کے لئے دیکھیے۔

(I) Britanica Encyclopedia Ammonius Saccas & Plotin

(ii) History of Westrn Phylosophy By Bertrand Russel p. 308

۳۲۔ الفہرست ابن الندیم ص ۳۴۲

۳۳۔ المصدر نفسہ ص ۱۱۸

۳۴۔ Catgory

۳۵۔ Berierimeneias

۳۶۔ analitic

۳۷۔ دیکھئے: الفہرست ابن الندیم ؛ سنی ملوک الارض حمزہ بن حسن اصفہانی اور مروج الذہب مسعودی

۳۸۔ عصر المامون جلد اول ص ۳۶۰

۳۹۔ تجارب السلف ص ۱۵۷

☆ یہ مقالہ ابن سینا پر فارسی زبان میں لکھی گئی ڈاکٹر صادق کیہرین کی کتاب سے ماخوذ ہے جس کا ترجمہ ڈاکٹر سید حسن عباس صاحب، لکچرار شعبۂ فارسی، بنارس ہندو یونیورسٹی نے کیا ہے۔

☆☆☆

پیام اعظمی

اتحاد

نظامِ گردشِ ایام اتحاد سے ہے — یہ رونقِ سحر و شام اتحاد سے ہے
وجودِ عظمتِ اقوام اتحاد سے ہے — فروغِ پرچمِ اسلام اتحاد سے ہے
الگ رہیں تو یہ ذرے غبار بنتے ہیں
ہو اتحاد تو پھر کوہسار بنتے ہیں

خدا ہے ایک نبیؐ ایک ہے کتاب بھی ایک — سوال ایک ہے اس قوم کا جواب بھی ایک
ہے ایک دین شریعت کا ہے نصاب بھی ایک — جو اختلاف رہیں گے تو ہے عذاب بھی ایک
کوئی بتادے یہ طاغوت کے دلالوں کو
ابھی اٹھائیں نہ ان خانگی سوالوں کو

ابھی تو دین کی عظمت پہ ظلم کا ہے حصار — ابھی تو قوم پہ ہے کفر و شرک کی یلغار
ابھی تو غیرتِ اسلام کو نہیں ہے قرار — ابھی تو مشترکہ دشمنوں سے ہیں دوچار
ابھی تو بیت مقدس سے شرمسار ہیں ہم
ابھی تو گنبدِ خضرا کے قرضدار ہیں ہم

ابھی تو چار طرف ہے جہالتوں کی فصیل — ابھی جلانی ہے علم و یقین کی قندیل
ابھی تو راستہ رو کے ہوئے ہے اسرائیل — ابھی تو قوم کو ہے انتظار بانگِ اصیل
ملے گا وقت تو پھر اختلاف کرلیں گے
جو بیٹھیں گے تو زمیں اپنی صاف کرلیں گے

ابھی تو ملک میں بغض و حسد کا ڈیرا ہے — ابھی تو وادیٔ لبنان میں اندھیرا ہے
ابھی تو مصر میں ظلم و ستم کا گھیرا ہے — ابھی عراق میں بیٹھا ہوا لٹیرا ہے
بچے گی جان تو آپس میں خوب لڑلینا
ادا ہو فرض تو پھر نافلہ بھی پڑھ لینا

خلیل عیسیٰ

دعائے اتحاد

مدح مولاؑ کا فقط اتنا صلہ دے یارب
تو ہمیں صاحب کردار بنادے یارب
ایک ہوجائیں مسلمان زمانے بھر کے
جتنے جھگڑے ہیں یہ آپس کے مٹادے یارب
جو بھی آپس میں لڑاتے ہیں مسلمانوں کو
ایسے لوگوں کو کوئی سخت سزادے یارب
پھر سے فرعون ہوئے جاتے ہیں سارے حاکم
پھر کسی ہاتھ میں موسیٰؑ کا عصا دے یارب
کوئی ظالم کی حمایت نہ کرے دنیا میں
سب کو تو حامی مظلوم بنادے یارب

معجز سنبھلی

امیں ہیں کہ نہیں

ہم پیمبر کی ہدایت کے امیں ہیں کہ نہیں؟
یہ کبھی سوچا شریعت کے امیں ہیں کہ نہیں؟
کچھ بھی کردار محمدؐ کی جھلک ہے ہم میں ؟
ہم بھی انوار رسالت کے امین ہیں کہ نہیں ؟ !

جس نے اخلاق سے غیروں کو بنایا اپنا
ہم بھی اس خلق کی دولت کے امیں ہیں کہ نہیں؟!
جس نے اخلاص و صداقت سے سدا کام لیا
ہم بھی اس حق و صداقت کے امیں ہیں کہ نہیں؟ !
جس نے فاقہ میں بھی سائل کو نہ خالی پھیرا
ہم بھی اس شان سخاوت کے امیں ہیں کہ نہیں ؟!
ہم بھی اس قوت باطل سے نہ دبنے والے
حق پہ سر دینے کی ہمت کے امیں ہیں کہ نہیں؟!

☆☆☆☆

در مدح حضرت علی

انیس احمد خاں انیس، نئی دہلی

دیوارِ کعبہ در ہوئی یہ واقعہ بھی دیکھ
تاریخ دیکھ دین کی جغرافیہ بھی دیکھ

ہجرت کی رات کا تو ذرا واقعہ بھی دیکھ
خیرالوریٰ بھی نائب خیرالوریٰ بھی دیکھ

قبضے میں ان کے وقت ہے یہ معجزہ بھی دیکھ
سورج کو آسمان سے پلٹتا ہوا بھی دیکھ

خیبر میں ورد نادِ علی من رسول کا
آنکھوں سے اپنی قوت مشکل کشا بھی دیکھ

در علم کا کھلا نہ تو دیکھے گا شہر کیا
منزل ہیں مصطفیٰ تو رہ مرتضیٰ بھی دیکھ

لڑتے ہیں ذوالفقار سے اللہ کی راہ پہ
لکھتے ہیں وہ قلم سے پیامِ خدا بھی دیکھ

نانِ جویں کے ٹکڑوں کی لذت نہ پوچھ کچھ
اس در کا ہو گیا ہے فرشتہ گدا بھی دیکھ

تیرہ رجب کا کرتا تھا مدت سے انتظار
بزمِ مقاصدہ میں ہے حاضر خدا بھی دیکھ

گستاخیٔ غنیم پہ جان اس کی بخش دی
اسلام کا انیس مرے فلسفہ بھی دیکھ

❀❀❀

منقبت

جو عہد آئے ہیں کرکے سر الست علیؑ
تمام خلق کار کھتے ہیں بندبست علیؑ

بندیوں پہ کھڑے آپ ہوتے رہیے گا
نہ کل تھے لپت علیؑ اور نہ اب ہیں لپت علیؑ

کسی حسینؑ کی آمد کا انتظار لئے
کھڑے ہیں آج بھی کرب وبلا بدست علیؑ

بدن سے کھینچ لو پیکاں کہ قتل کرڈالو
مئے رضائے خداوند میں ہیں مست علیؑ

بھٹک کے ان سے جہالت کی موت مرنا ہے
عقیدتوں کے جہاں کی ہیں بودوہست علیؑ

تلاش کرتے ہو کیوں مجمع صحابہ میں
ہے جبرئیلؑ کا رضوان کا ہم نشست علیؑ

ہم اپنے سجدوں پہ نازاں نہیں ہیں اے کیفیؔ
بروز حشر ہمارے ہیں پرست علیؑ

کیفی سنبھلی

علیؑ علیؑ

ذکی فہیم اور علیم ودیدہ ور علیؑ علیؑ

ہیں شہرِ درس و علم کا عظیم در علیؑ علیؑ

☆☆☆

رہِ حیات میں ہو وردِ معتبر علیؑ علیؑ
بہ ہر قدم صدا رہے یہ ہم سفر علیؑ علیؑ

☆☆☆

ہر ایک شرک و کفر کی سیاہ شب کا خاتمہ
نقیبِ نور نعرہ زن دمِ سحر ، علیؑ علیؑ

☆☆☆

جہاں اہل بیت میں نبیؐ کی پاک نکہتیں
روش روش چمن ، شجر شجر ہے علیؑ علیؑ

☆☆☆

یداللہ آپ ہیں ، بساطِ خیبری ہے کیا !
بڑی مہم ہو کتنی بھی، ہو پل میں سر، علیؑ علیؑ

☆☆☆

برائے رد مشکلات و غم ، بفضلِ لم یزل
ہے اسمِ پاک پہ جلال و یہ اثر علیؑ علیؑ

☆☆☆

سخن سخن زباں زباں نظر نظر بیاں بیاں
ہے خوب منقبت مگر پسِ ہنر علیؑ علیؑ

☆☆☆